راوی فاؤنڈیشن کے زیرِاہتمام مسلسل اشاعت کا 23واں سال

ماہنامہ

ارژنگ لاہور

Monthly
Arxang
Lahore

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی
مدیر: حسن عباسی

نیا سال مبارک 2022

جنوری 2022ء

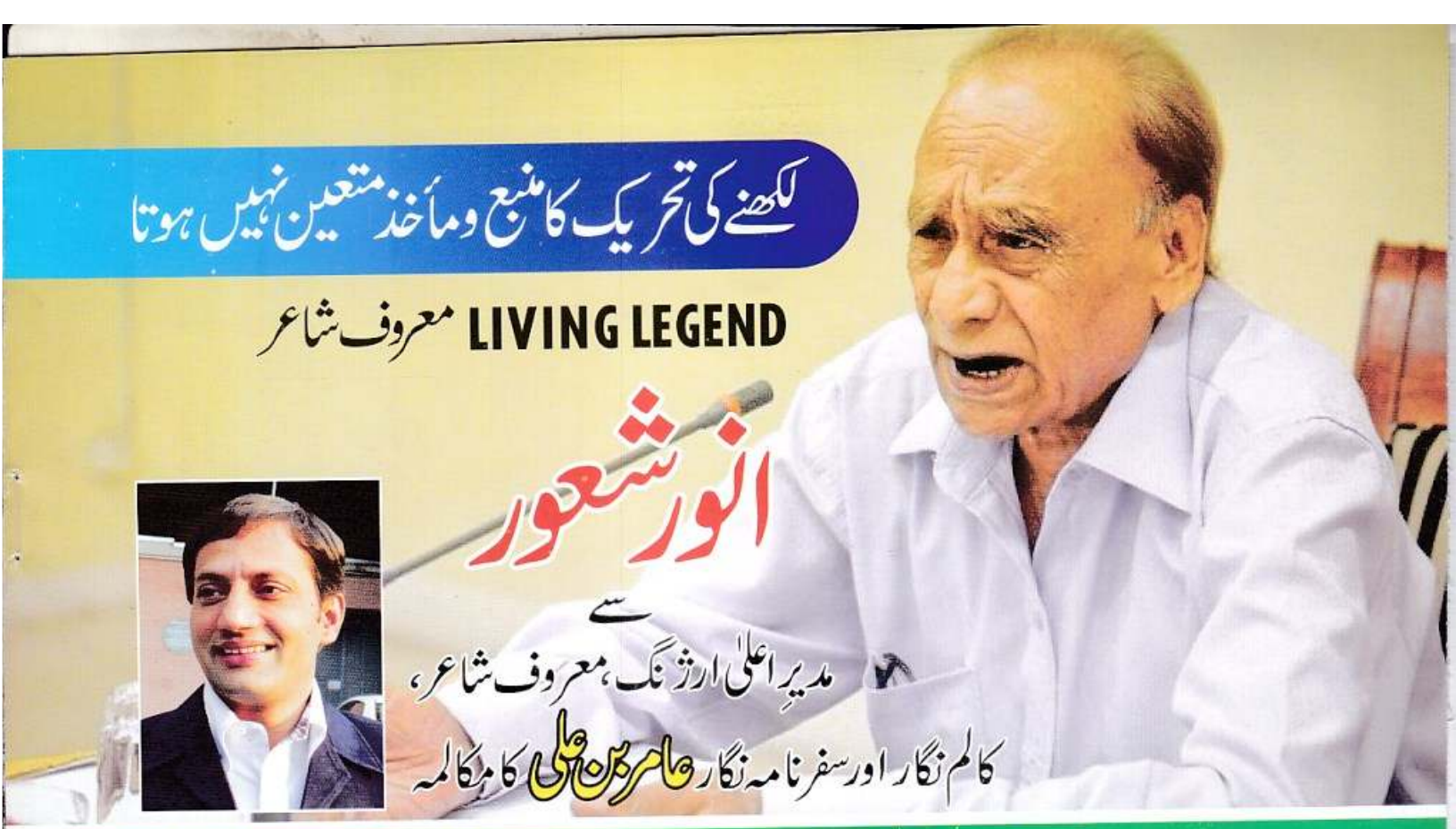

لکھنے کی تحریک کا منبع و مأخذ متعین نہیں ہوتا

LIVING LEGEND معروف شاعر

انور شعور

سے

مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر، کالم نگار اور سفر نامہ نگار **عامر بن علی** کا مکالمہ

جس سے جو کچھ حاصل ہوا مومن کی گمشدہ میراث سمجھ کر شکریے کے ساتھ قبول کر لیا

آبائی تعلق فرخ آباد کے یوسف زئی خاندان سے ہے۔ ولادت 11 اپریل 1943ء کو غالباً سیونی میں ہوئی۔ یہ بھارتی صوبے مدھیہ پردیش کا ایک شہر ہے۔ 1947ء میں ہم لوگ پاکستان بنتے ہی بمبئی سے کراچی آ گئے۔ کراچی اور میں ساتھ ساتھ بڑے ہوئے ہیں۔ یعنی بچپن کے دوست ہیں۔ شروع میں کچھ عرصے بوہرہ پور کے علاقے میں قیام کیا۔ پھر نظام آباد کی بنیاد پڑی تو ہم وہاں منتقل ہو گئے۔ کھیل کود (اور شرارتوں) کا زمانہ ناظم آباد ہی میں گزرا۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ والد صاحب کے ساتھ نماز کے لیے مسجد جانا ہوتا تھا۔ وہاں نعت (نعت خوانی کی) محفلیں ہوتی تھیں۔ ان میں شرکت کے باعث مجھے بھی نعت خوانی کا شوق ہو گیا۔

اس شوق میں اردو اور فارسی کی بے شمار نعتیں یاد کرنے کا موقع ملا۔ اس لیے طبیعت خو بخود یعنی خواہ مخواہ موزوں ہو گئی اور میں تک بندی کرنے لگا۔ بچوں کے تقریباً تمام رسالے نظر سے گزرتے تھے۔ حمد و نعت کے علاوہ بچوں کی نظمیں بھی مجھ سے سرزد ہونے لگیں اور یہ ''کلام'' بچوں کے پرچوں میں تواتر سے چھپنے بھی لگا۔ اُن دنوں میرا شاعرانہ نام انور افسری تھا۔ ویسے اعلیٰ نام انوار حسین ہے۔ افسر میرے استاد کا نام تھا، اُن کی نسبت سے میں خود کو افسری لکھتا تھا۔ بعد میں یہ نام بدلنا پڑا۔ دوست مذاق اُڑاتے تھے کہ افسری تو نسوانی نام ہوتا ہے۔ بات صحیح تھی اس لیے میں افسری کے بجائے افسر بن گیا۔ پھر شعور تخلص رکھا تو انور افسر شعور ہو گیا۔ اس کے علاوہ کچھ دنوں شعور انور کے نام سے بھی لکھا۔ میں نے تین اُستادوں سے شاعری پر اصلاح لی۔ مولانا اختر صابری، حضرت تابش دہلوی اور حضرت سراج الدین ظفرؔ ان کے علاوہ بے شمار لوگوں سے فیض اُٹھایا اور سب سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 23 واں سال

Monthly Arxang Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 23 جنوری 22 شمارہ 1

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیران ◉ حسن عباسی ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس ادارت}

◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ سعدیہ سیٹھی

{مجلس مشاورت}

◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ ◉ زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 نوٹ گرافر ◉ نعمان حسن :0333-4918383

سرورق: عمران شناور

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازاکاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو پی ایل او منی سے رقم بھیجیں اور سالانہ ممبر بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد، نعت ' 2

مضامین:

- ہم بھی وہاں موجود تھے/ جمیل یوسف ' 3
- فنافی النعت راجا رشید محمود/ ڈاکٹر شاکر کنڈان ' 7
- گفتگو کا چراغ/ افتخار شفیع ' 10
- حسن عباسی کا حمدیہ مجموعہ "صاحب"/ نسیم سحر ' 14
- مکافاتِ محاورات/ امجد محمود چشتی ' 16
- علی سیاف کے اُردو ناول "عالیہ" کا ایک سرسری جائزہ/ پروفیسر رانا محمد یعقوب ' 17
- "مدحِ محمود" وفورِ شوق اور جذبۂ ایمانی کا آئینہ مصفا/ تصور اقبال' 19
- حمدیہ شاعری اور ریاض ندیم نیازی / واجد امیر ' 21
- راجا غلام اصغر طاہر کے قلم کی روانی / کرامت بخاری ' 23
- دشتِ دروں / وحید ناز ' 24
- حمدیہ شاعری اور ریاض ندیم نیازی / واجد امیر ' 21

شاعری 26 تا 28

تبصرہ: ناول "کماری والا" / شہناز نقوی ' 29

افسانے:

- مسیحا / فخر زمان ' 30
- ڈھائی کنال کی جنت/ پروفیسر نور کمال شاہ ' 33
- انجانا خوف/ عاصم بخاری ' 37
- Alone / نوین روما ' 40

سفرنامے:

- ابن عربی اور ارطغرل/ عامر بن علی ' 41
- پاکستان کے سوئٹزرلینڈ میں /لبنیٰ صفدر ' 43

خاکہ: ○ ابو جی / شہزاد نیر ' 47

بقیہ انٹرویو: انور شعور / 54

- مختصر ادبی خبریں ' 58
- نامہ ہائے احباب ' 59

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo. 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

حمد

سمجھ سے اپنی ہے بالا صاحب
تمہارا دفتر نرالا صاحب
یہ آسماں ہے کہ ہے صراحی
زمین ہے یا پیالہ صاحب
ہے پھول رنگین اس قدر کیوں
ہے بھنورا کیوں اتنا کالا صاحب
یہ چاند ہے یا کہ مکڑی کوئی
یہ ہالہ ہے یا کہ جالا صاحب
ہے کوئی پروردہ قہقہوں کا
کسی کو اشکوں میں ڈھالا صاحب
ہماری آنکھیں ہیں یا ہے کوئی
تمہارا برساتی نالہ صاحب
یہ کس نے ہم کو گرایا اکثر
یہ کس نے ہم کو سنبھالا صاحب
شکستہ کاغذ پہ چھپتا کیوں ہے
یہ زندگی کا رسالہ صاحب
مقدر اپنا کہاں کھلے گا
تمہارے در پہ ہے تالا صاحب
ہر ایک ناکے پہ ہم تو دیں گے
فقط تمہارا حوالہ صاحب
ظہور دونوں میں ہے تمہارا
اندھیرا ہو یا اُجالا صاحب

حسن عباسی/لاہور

مان آپ ﷺ ہیں ہمارا

(صنعتِ اشتقاق)

کرنا کریم مجھ پر چشمِ کرم خدارا
میرا سوا تمہارے کوئی نہیں سہارا
نظروں میں سبز گنبد ہے بے نظیر سارا
اس منظرِ حسیں کا پرنور ہے نظارا
ہیں آپؐ کے بھکاری ہے بھیک پر گزارا
سب آپ کی ہے نسبت مان آپؐ ہیں ہمارا
وہ آپ ہی کی ہستی ہے دو جہاں میں آقاؐ
ہے بے کنار رحمت جس کا نہیں کنارہ
تصدیق صدقِ دل سے معراج کی تھی کر دی
جس وقت مشرکیں نے صدیقؓ کو پکارا
محشر میں حشر نا ہو چشمِ کرم کریما
ہم آپؐ کے سوالی ہے آپ کا سہارا
چندہ کو چاندنی بھی اس در سے ہی ملی ہے
دربارِ مصطفیٰؐ سے چمکا ہر اک ستارہ
آقاؐ نے مسکرا کر کلیوں کو تازگی دی
لی سانس پھر گلوں کو گلشن میں ہے نکھارا؟
ساجدؔ بیاض سے تو کر کے شمار نعتیں
ترتیب خوبصورت دے نعت کا شمارہ

محمد امین ساجد سعیدی/حاصل پور

حسنِ کونین ترے حسن پہ وارے ہوں گے
جونہی یزداں نے ترے نقش نکھارے ہوں گے
چاند تھا نور کے حلقے میں مقید شب بھر
گیسوئے ناز محمدؐ نے سنوارے ہوں گے
تذکرہ شب کی سیاہی نے جو چھیڑا ہے تو پھر
آج مضمون تری زُلف کے سارے ہوں گے
ناچتا ہوگا قمر جن کی حسیں جنبش پر
کیسے معصوم وہ اُنگلی کے اشارے ہوں گے
لوگ کہتے ہیں جسے دیپ ریاض الجنت
اس جگہ آپ نے نعلین اُتارے ہوں گے

مجتبیٰ شہزاد دیپؔ

نظر میں نور رہے سانس بھی بحال رہے
پڑھو درود کہ دھڑکن میں اعتدال رہے
بسی ہوئی ہو محمدؐ کی یاد جس دل میں
تو کیسے اس میں کوئی غم رہے ملال رہے
سنبھل کے چلنا، ادب سے جھکائے سر اپنے
کہ بارگاہِ رسالت ہے یہ خیال رہے
انہی کے نام سے روشن رہے جبیں میری
انہی کے ذکر سے مہکا ہر اک خیال رہے
کرم حناؔ پہ ہو اتنا ہی بس مرے آقاؐ
کہ نعت ہی سے فقط دل کا اندمال رہے

حنا کوثر/منڈی بہاؤالدین

ہم بھی وہاں موجود تھے

جمیل یوسف/مری

جب جناب جنرل عبدالمجید ملک صاحب کی خود نوشت داستانِ حیات ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' کا نام سننے میں آیا تو معاً مجھے پیرومرشد سید ضمیر جعفری مرحوم کا وہ جملہ یاد آ گیا جو انہوں نے مشہور مزاح نگار کرنل محمد خان کے مجلّے اردو پنچ کے پہلے شمارے پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ کہا تھا ''آپ نے تو قارئین کا آدھا دل رسالے کے نام اور سرورق سے ہی موہ لیا ہے۔''

محترم جناب عبدالمجید ملک نے اپنی کتاب کی نصف کامیابی تو اس کے نام سے ہی حاصل کر لی ہے۔ ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' کسی بھی خودنوشت سوانح عمری کا ایک نہایت خوبصورت اور معنی خیز نام ہے۔ آپ نے ابن انشاء کے یہ مشہور بلکہ زبان زدِ خاص و عام اشعار ضرور سنے ہوں گے:

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا
ہم بھی وہاں موجود تھے، ہم سے بھی سب پوچھا کیے
ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردا ترا

مگر جنرل عبدالمجید ملک صاحب چپ نہیں رہے۔ نہ انہیں کسی کا پردا منظور تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سنا، سب کچھ برملا لکھ دیا ہے۔ البتہ اگر کچھ کلام ہو سکتا ہے تو اس کام میں جو انہوں نے کیا ہے یا نہیں کیا ہے۔

ماشاء اللہ اب جنرل صاحب کی عمر عزیز ۹۵ سال کے لگ بھگ ہے۔ ان کی خودنوشت کم و بیش پچھلے ۷۵ سال پر پھیلی ہوئی طویل کہانی ہے جسے انہوں نے کہیں تفصیل اور کہیں اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ صرف ان کی ذاتی کہانی نہیں ہے بلکہ پچھلے ۷۵ سال میں یعنی ۱۹۴۰ سے لے کر جب وہ بیس اکیس سال کے تھے، ۲۰۱۵ء تک کہ اب وہ ۹۵ سال کے ہیں۔ جو کچھ ان پر گزری اور جو کچھ اُن جیسے جرنیلوں اور سیاست دانوں کے ہاتھوں وطن عزیز پاکستان پر گزری ہے اس سب کا حال ہے۔ شاید ہی اس وقت پاکستان میں جنرل عبدالمجید ملک صاحب سے زیادہ طویل العمر کوئی اور بزرگ سیاستدان ہو جس نے نہ صرف تحریک پاکستان کے آخری مراحل، ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک اور قیام پاکستان کے بعد سے لے کر اب تک کے واقعات کو اتنے قریب سے دیکھا ہو اور پاکستانی فوج کے اندرونی رازوں سے بھی اس قدر آگاہ ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ جنرل صاحب نے ان حالات و واقعات کی تشکیل پذیری میں بھی بالخصوص ۱۹۸۵ء سے لے کر ۲۰۱۳ء تک کبھی سامنے اور کبھی پس پردہ عملی کردار بھی ادا کیا ہے اس لیے اُن کی یہ خودنوشت پاکستان کی تاریخ کا ایک مستند حوالہ بھی ہے۔ اُن کے بیان کی تفصیل اور بعض مقامات پر ان کا اختیار کردہ اختصار، دونوں بہت کچھ بتاتے ہیں۔

جناب جنرل عبدالمجید ملک کو یہ منفرد اعزاز بلکہ افتخار بھی حاصل ہے کہ وہ پاکستان کے اکلوتے جرنیل ہیں جنہوں نے فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد بغیر کسی حکومتی تائید وحمایت کے اور بغیر کسی قسم کے سیاسی پس منظر کے، عملی سیاست میں قدم رکھا اور اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اپنے حلقہ انتخاب سے جنرل صاحب ایک دو دفعہ نہیں بلکہ پورے پانچ دفعہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔ متعدد بار وفاقی وزیر کے عہدے پر متمکن رہے ہیں۔ جب وہ وفاقی وزیر خوراک و پیداوار تھے یو این او کے عالمی ادارے ایف اے او (فوڈ اینڈ ایگری کلچر آرگنائزیشن) کے روم میں منعقدہ سالانہ اجلاس کے صدر چنے گئے اور اس حیثیت میں پاپائے روم نے انہیں ملاقات کی دعوت دی۔ یہ اعزاز پاکستان کے کسی اور وزیر، سفیر یا جرنیل کو نہیں ملا۔

پاک فوج کے جرنیلوں میں بھی جنرل عبدالمجید ملک صاحب کو یہ منفرد امتیاز حاصل ہے کہ جب ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہمارے سارے جرنیل سر بہ زانو تھے اور جنرل یحییٰ اور جنرل نیازی ہتھیار ڈالنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے جنرل عبدالمجید ملک نے حسینی والا سیکٹر میں دفاعی پوزیشن سے خود اپنے طور پر آگے بڑھ کر بھارتی علاقے پر یلغار کر دی اور دشمن کے علاقے میں گھس کر اچانک حملہ کر کے بھارت کے قیصر ہند نامی قلعے پر قبضہ تعرلیا۔ وہاں موجود بھارتی فوجیوں کے پاس بدحواسی میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا۔ جنرل عبدالمجید ملک نے بھارت کے قیصر ہند قلعے پر پاکستانی پرچم لہرا دیا۔ پھر جب ۱۹۷۲ء میں جنرل صاحب کو جی او سی ۱۲ ڈویژن مری لگایا گیا تو انہوں نے ایک اور بہادری اور جرأت کا کارنامہ سرانجام دیا۔ ہوا یوں کہ ابھی وہ مری پہنچے ہی تھے اور ابھی انہوں نے اپنی کمان سنبھالی بھی نہ تھی کہ بھارتی فوج نے گزشتہ رات آزاد کشمیر میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر

واقع پاکستان کی تین فوجی چوکیوں پر اچانک حملہ کر کے قبضہ کرلیا اور ہمارے کئی فوجی جوانوں کو شہید کر دیا۔ جنرل صاحب اُسی دن اپنی فوجی چوکیاں بھارت کے قبضے سے چھڑانے پر کمربستہ ہوگئے۔ ان دنوں ہماری فوج کا مورال ڈاؤن تھا۔۱۹۷۱ء کی جنگ میں عبرتناک بلکہ شرمناک شکست کے نتیجے میں ہمارے پچاس ساٹھ ہزار فوجی اپنے کاغذی ٹائیگر جنرل نیازی کے حکم پر بھارت کے قیدی بن چکے تھے بھارتی فوجی اونچی ہواؤں میں تھے۔ اسی برتری کے زعم میں انہوں نے کشمیر میں پیش قدمی کر کے تین پاکستانی چوکیوں پر اچانک حملہ کر کے قبضہ کرلیا تھا۔ جنرل عبدالمجید ملک کا موقف یہ تھا کہ فوری طور پر ایکشن لیا جائے اور بھارتیوں کو ان چوکیوں سے مار بھگایا جائے ورنہ ہماری فوج میں مزید بددلی اور مایوسی پھیلے گی۔ اس وقت کے کمانڈر انچیف کے تحفظات کی پروا نہ کرتے ہوئے جنرل عبدالمجید ملک نے مظفرآباد میں اپنے فوجی دستوں کو فی الفور ایکشن کارروائی کا حکم دیا۔ خود آپریشن کی نگرانی کی۔ اگلی صبح جب بھارتی فوجی ابھی جاگے بھی نہ تھے ہمارے مجاہد ان کے سروں پر پہنچ گئے اور وہ دو تین لاشیں چھوڑ کر سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔ تینوں چوکیوں پر پاکستان کا قبضہ بحال کر دیا گیا۔ اس دوران دہلی سے مقبوضہ کشمیر کی ہائی کمان کو بھیجا گیا ایک سگنل پیغام پکڑا گیا جس میں بھارتی کمانڈر کو خبردار کیا گیا تھا کہ مری میں جو نیا جی او سی آیا ہے یہ وہی جنرل ہے جس نے قیصر ہند قلعے پر حملہ کیا تھا۔ اس لیے محتاط اور چوکس رہو۔

جنرل عبدالمجید ملک کی آپ بیتی میرے لیے اس لیے بھی خصوصی دلچسپی کا موجب ہے کہ جنرل صاحب میرے گرائیں ہیں۔ ان کا گاؤں جند میرے آبائی گاؤں لنگاہ سے صرف دو ڈھائی کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ لنگاہ وہی گاؤں ہے جس کے بارے میں کرنل محمد خان نے لکھا ہے کہ یہ قصبہ بڑا مردم خیز اور زن شناس ہے۔ جنرل صاحب سے محبت کا ایک اور رشتہ بھی ہے وہ میرے والد گرامی قابل صد احترام شیخ محمد یوسف مرحوم کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک شام جب سینئر جنرل عبدالقیوم مجھے چکوال میں جنرل عبدالمجید ملک صاحب کے گھر لے گئے تو میں نے کہا میرے شاگرد مجھے میرے اباجی کے شاگرد سے ملنے لائے ہیں۔ جنرل عبدالقیوم پر مجھے فخر ہے۔ ان کے کالموں کے مجموعے فکر و خیال میں ان کے بارے میں میرا مضمون پڑھیں۔

میں جنرل عبدالمجید ملک صاحب کو ذاتی طور پر ۱۹۶۷ء سے جانتا ہوں۔ جب وہ پشاور میں کرنل سٹاف تھے۔ ان دنوں میری پوسٹنگ بھی پشاور میں تھی۔ پھر جب ۱۹۷۵ء میں دوبارہ میں پشاور پوسٹ ہوا تو جنرل صاحب پشاور میں کور کمانڈر تھے۔ جنرل صاحب خاصا شستہ ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ انہیں متعدد اشعار یاد ہیں۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں اپنے اردگرد کے ماحول کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔ اپنی جوانی کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارا علاقہ اگرچہ مسلم اکثریتی علاقہ تھا۔ مگر ہر گاؤں میں دو یا تین ہندوؤں اور سکھوں کے گھر ضرور تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے تجارت پر اجارہ داری حاصل کر رکھی تھی اور مسلمان اکثر اوقات ان کے مقروض اور مرہونِ احسان ہی رہتے۔ کسی بھی گاؤں میں ان غیر مسلموں کے گھر معاشی طور پر مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ایک بات جس کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندو اور سکھ اور مسلمان، ان تینوں کے درمیان جو افہام و تفہیم تھی اس کی صورتِ حال موجودہ صورتِ حال سے بہت بہتر تھی جو کہ اب مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس زمانے میں نہ اتنے عالم تھے اور نہ اتنی کتابیں۔ سیدھے سادے مسلمان تھے جن میں بغض اور نفاق کا شائبہ تک نہ تھا۔ عبادت گاہوں میں بھی کسی ایسے پہلو کا ذکر نہیں کیا جاتا تھا جس سے فرقہ واریت کا اظہار ہو۔ لوگوں کے عقائد پر کوئی سوالیہ نشانات نہیں تھے۔ لوگوں کا ایمان اور عقیدہ سادہ مگر مضبوط تھا اور اس میں کوئی پیچیدگی یا ملاوٹ نہیں تھی۔ اس دور کے سادہ طرزِ زندگی میں برداشت کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ وہ دور نہایت پرسکون دور تھا۔ وسائل نہ ہونے کے باوجود لوگ مطمئن تھے...... اُس دور میں سارے معاشرے اور ماحول پر ایک خاص قسم کی معصومیت اور سادگی کی فضا غالب تھی۔ دیہات میں خواتین ظاہری پردہ نہیں کرتی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں موجودہ زمانے والی بے باکی کے بجائے حیا کا عنصر موجود تھا اور مرد بھی صحیح معنوں میں خواتین کا احترام کرتے تھے۔ کیا مجال جو کوئی مرد کسی کی بہن بیٹی کو آنکھ اُٹھا کر غلط نگاہ سے دیکھے۔ اکثر گھروں کی چار دیواری نہیں ہوتی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کے صحن سے گزرتے رہتے تھے لیکن کسی کو کوئی شکایت ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی غیر اخلاقی اور غیرت کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ اگر کبھی بدقسمتی سے کسی گاؤں میں کوئی لڑائی یا جھگڑا ہو جاتا تو اس میں صرف ڈانگ ہی چلتی، وہی اُس دور کی کلاشنکوف تھی...... صبح سویرے کسان اور دوسرے پیشوں کے لوگ جلدی جاگ اُٹھتے تھے۔ کسان کھیتوں میں ہل چلانے جاتے اور دن کے دس گیارہ

بجے انہیں گھر سے روٹی اور لسی وغیرہ بھیجی جاتی۔ دوپہر کو ہانڈی پکانے کا سلسلہ بالکل نہیں تھا اور نہ ہی چائے کا رواج تھا۔ بلکہ چائے نام کی چیز سے لوگ بالکل ہی ناواقف تھے۔ سب لوگ دن میں عام طور پر صرف دو بار ہی کھانا کھاتے تھے۔'' جنرل صاحب ۱۹۶۵ء کی جنگ کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اختر ملک پاکستان کے ایک بڑے باہمت جرنیل تھے جو چھمب جوڑیاں آپریشن کے انچارج تھے۔ اختر ملک نے چند روز میں حیرت انگیز حد تک کامیابی حاصل کی اور دریائے توی تک جا پہنچے۔ مگر عین اس وقت جب کہ اختر ملک کا اگلا قدم کامیابی اور کامرانی کی منزل پر پڑنے والا تھا اور اکھنور پر قبضہ یقینی نظر آ رہا تھا اس موقع پر صدر ایوب خان سے ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ اس نے ۱۲ ڈویژن کی کمان اختر ملک کے بجائے جنرل یحییٰ خان کو سونپ دی۔ جنگی حکمت عملی اور منصوبہ سازی کے لحاظ سے کسی بھی آپریشن کے دوران اُس کمانڈ کی تبدیلی جو کامیابی کی طرف گامزن ہو، اس کی مثالیں عسکری تاریخ میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ یہ عمل Changing horses in the middle کہلاتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ فیصلہ ہے جس کے مثبت نتائج نکلنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تصور کیے جاتے ہیں۔ ۱۲ ڈویژن کی قیادت کی اس تبدیلی کے دوران کمانڈرز کے چارج کے ہینڈنگ ٹیکنگ اوور کے عمل کے باعث ۲۴ سے ۴۸ گھنٹے کی جو تاخیر ہوئی، انڈین آرمی نے اس کا بھرپور فائدہ اُٹھایا اور دریائے توی کے اُس پار ان کو اپنی دفاعی پوزیشن مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ تبدیلی نہ ہوتی تو اکھنور پاکستان کی گرفت میں تھا۔''

جنرل صاحب نے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا کہ صرف کمان کی تبدیلی میں ہی قیمتی اور فیصلہ کن وقت ضائع نہیں ہوا بلکہ کمان سنبھالنے کے بعد براستہ گجرات محاذ جنگ پر جاتے ہوئے یحییٰ خان نے راستے میں اپنی داشتہ اقلیم اختر عرف جنرل رانی کے کوٹھے پر پڑاؤ ڈال دیا اور اپنی فرضی فتح کا جشن منانے میں مگن ہو گیا۔ شراب و شباب سے بڑھ کر اسے اور کوئی شے مرغوب نہ تھی۔

جنرل عبدالمجید ملک صاحب نے ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں لکھا کہ آپریشن کی کامیاب پیش رفت کے دوران کمان کی تبدیلی کا احمقانہ اور ملک دشمن عمل پھر دہرایا گیا اور اس بار خود جنرل یحییٰ نے جو زبردستی کا صدر پاکستان بنا بیٹھا تھا۔ مشرقی پاکستان کے محاذ پر جنرل نکا خان کی جگہ جنرل نیازی کو بھیج دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو مشرقی پاکستان میں پاک فوج کو شرمناک شکست سے دوچار کرانے کا اس کا منصوبہ ناکام ہو جائے۔ کیونکہ اس محاذ پر ذلت آمیز شکست اور مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے بغیر یحییٰ کے تاحیات صدر اور بھٹو کے تاحیات وزیراعظم بنے رہنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ یہی ان دونوں کا پلان تھا۔ بعد میں بھٹو کو یعنی الیکشن ۱۹۷۰ء میں ہارے ہوئے شخص کو جب یحییٰ نے اپنا نمائندہ بنا کر یو این او بھیجا تو وہ فوری طور پر سیدھا نیویارک پہنچنے کی بجائے بیماری کا بہانہ بنا کر لندن میں بیٹھا رہا کہ ڈھاکہ پر جب بھارتی فوج کا قبضہ ہو جائے تو پھر وہ اقوامِ متحدہ پہنچے۔ آخر جب وہ وہاں پہنچا تو اس وقت سیکورٹی کونسل کے اجلاس میں پولینڈ کی پیش کردہ قرارداد (نمبر 307) پر بحث ہو رہی تھی۔ اس قرارداد کی رو سے جنگ بندی ہو جاتی اور دونوں طرف کی فوجیں جنگ سے پہلے والی پوزیشنوں پر چلی جاتیں۔ مگر یہ بات نہ بھٹو کو منظور تھی اور نہ اس کے باس یحییٰ کو۔ چنانچہ بھٹو نے اس قرارداد کو پاکستان کی طرف سے منظور کرنے کی بجائے اسے پھاڑ کر فرش پر پھینک دیا اور اجلاس سے واک آؤٹ کر گیا۔ اُس نے کہا "I am wasting my time here" (دیکھیے صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵)

بھٹو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ڈھاکہ پر بھارتی فوج قبضہ کر چکی تھی۔ پولش ریزولیوشن کو بروئے کار لا کر بھارتی فوج کا قبضہ ختم کرانے کے بجائے بھٹو کو تو واپس اسلام آباد پہنچ کر بچے کھچے پاکستان کا اقتدار سنبھالنا تھا۔ وہ واقعی نیویارک میں اپنا وقت ضائع کر رہا تھا۔ اسی سچائی کو چھپائے رکھنے کے لیے تو اس کے اقتدار سنبھالنے کے بعد جنرل یحییٰ کو نظر بند کر دیا گیا تھا تاکہ اس کی زبان بند رہے۔ نہ اس کا ٹرائل ہوا اور نہ حمود الرحمان کمشن کی رپورٹ شائع کی گئی۔

اب جنرل عبدالمجید ملک صاحب کی داستانِ حیات کی طرف لوٹتے ہیں۔ جنرل صاحب نے فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد جب سیاست میں قدم رکھا تو بلاشبہ قدم قدم پر حیران کن اور بے مثال کامیابیاں حاصل کیں۔ یہ ان کی زبردست حکمت عملی، منصوبہ بندی، عزمِ صمیم اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ان مراحل کا انہوں نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ چکوال میں مدتوں سے مسلط سردارانہ جاگیرداری نظام کے خلاف اُٹھے تھے اور انہوں نے نہایت کامیابی سے اس ظالمانہ تسلط کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ جنرل صاحب بھی آخر میں پاکستان کے روایتی سیاست دانوں کی طرح مصلحت اور مفاد پرستی کا شکار ہو گئے اور اقتدار کی ہوس میں انہی سرداروں اور جاگیرداروں سے سمجھوتہ اور اتحاد کر لیا

جن کے خلاف اُٹھے تھے۔" کتاب کے صفحہ نمبر ۲۷۲ پر خود لکھتے ہیں:

"کچھ حلقوں نے کہا کہ جنرل صاحب نے ضلع چکوال سے سرداری نظام کے جس پودے کو اکھاڑنے کا عزم کیا تھا، اس کو ایک مرتبہ پھر پانی دے کر ہرا کر رہے ہیں۔ میرے کچھ قریبی دوستوں نے بھی سردار گروپ سے سیاسی الحاق کی کڑوی گولی نگلنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔ مگر ہم حالات وواقعات کے تناظر میں یہ سب کچھ کر گزرے۔" جنرل صاحب نے یہ واضح نہیں کیا کہ یہ تناظر کیا تھا اور ہر قیمت پر اقتدار کے حصول کی اس بھونڈی کوشش کا آخر کیا جواز تھا۔ نہ اپنے قریبی حلقوں کا صائب مشورہ اور نہ غیروں کی کڑی تنقید، ان کو مفاد پرستانہ اقدام سے باز رکھ سکی۔ وہ خالص جمہوری عمل سے وفاقی وزارتوں تک پہنچے تھے۔ مگر اب انہوں نے فوجی ڈکٹیٹر جنرل مشرف کے حواریوں کے گھٹنے چھونے شروع کر دیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جب کسی چیز کے حصول کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں تو کسی رکاوٹ سے نہیں رُکتے۔ مگر ان کے اس ثابت شدہ رویے اور طرزِ عمل کی روشنی میں چکوال ریلوے لائن اُکھاڑے جانے کے حوالے سے ان کا یہ بیان قاری کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب مندرہ بھون ریلوے سروس کا خاتمہ ہوا تو میرے مخالفین نے اس معاملے کو بہت اُچھالا اور مجھے بلاوجہ اس کا قصوروار گردانا گیا۔ میرے لیے ضروری ہے کہ میں ریلوے کے اس معاملے کے حقائق واضح کروں۔ اصل صورتحال یہ تھی کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں پاکستان ریلوے کا محکمہ اچانک خسارے میں چلا گیا (جنرل صاحب نے اس کے اسباب بیان نہیں کیے)۔ ریلوے نے ملک بھر میں ان ریلوے لائنز کا جائزہ لیا جو اس خسارے کا باعث تھیں (کوئی ریلوے لائن خسارے کا باعث نہیں تھی۔ یہ سب ریلوے حکام کی ٹرانسپورٹ مافیا کے ساتھ ملی بھگت کا نتیجہ تھا)۔ بدقسمتی سے مندرہ چکوال بھون ریلوے لائن مذکورہ خسارے کے حساب سے سرفہرست تھی۔ مجھے جب اس بات کا علم ہوا کہ پاکستان ریلوے کا محکمہ مندرہ چکوال لائن کی بندش کے بارے میں سوچ رہا ہے تو میں نے وزارتِ ریلوے اور دیگر حکام سے دو دفعہ رابطہ کیا۔ تو انہوں نے دونوں مرتبہ حقائق اور اعداد وشمار پیش کر کے ایسے ٹھوس دلائل دیے جن کو رد کرنا ممکن نہ تھا۔ ریلوے حکام نے آخری اجلاس میں جب ہمارے سامنے اپنے اعداد وشمار رکھے تو ہم لاجواب ہو گئے۔" (صفحہ ۳۰۳)

یہ اندازِ بیان ہی چغلی کھا رہا ہے جناب جنرل صاحب! آپ اتنی آسانی سے لاجواب کیسے ہو گئے۔ آپ نے ریلوے حکام کو یہ کیوں نہ بتایا کہ مندرہ چکوال ریلوے لائن کے خسارے کی اصل وجہ یہ تھی کہ چکوال کی ٹرانسپورٹ مافیا سے ملی بھگت کر کے محکمہ ریلوے نے گاڑی کے اوقات ایسے رکھے ہوئے تھے کہ لوگ اس پر سفر نہ کر سکیں۔ گاڑی صبح تین بجے چکوال سے راولپنڈی کے لیے چلائی جاتی تھی اور اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ آٹھ نو بجے یعنی پانچ چھ گھنٹے بعد راولپنڈی پہنچے۔ پھر اسے لیٹ کر کے مزید دیر سے پہنچنے کے ہتھکنڈے بھی تھے۔ اس سازش سے ریلوے سسٹم کو جان بوجھ کر تباہ کیا گیا۔ کیا آپ اس سے بے خبر تھے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب ۱۹۷۲ء میں بھٹو وزیراعظم بنا اور اس نے جہلم کے انتخابی حلقے سے تعلق رکھنے والے ممبر قومی اسمبلی جناب ڈاکٹر غلام حسین کو وزیر ریلوے بنایا تو ڈاکٹر صاحب کے حکم پر چکوال ریلوے نے اپنے اوقات کا شیڈول بدلا۔ ٹرین صبح چھ بجے چکوال سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہونے لگی اور دو گھنٹے میں یعنی آٹھ بجے راولپنڈی پہنچنے لگی تھی۔ مسافروں کا اتنا رش ہو گیا کہ ٹرین کھچا کھچ بھری ہوئی ہوتی تھی۔ بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ آپ نے ریلوے حکام کو از سرِ نو ڈاکٹر غلام حسین کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی ہدایت کیوں نہ کی۔ آپ نے قارئین کو یہ بھی نہیں بتایا کہ ریلوے کی بندش سے فائدہ کس نے اُٹھایا۔ ٹرانسپورٹ مافیا اور اڈہ مافیا کے مالکان کون ہیں۔ چکوال ریلوے کی طرح میونسپل کمیٹی کے بنائے ہوئے وسیع وعریض اڈے کو بھی کیوں ناکارہ بنا کر رکھ دیا گیا۔ جنرل صاحب کو اس پر بھی کچھ روشنی ڈالنی چاہیے تھی۔

افسوس صد افسوس ہم نے ایک سو سال سے رواں دواں ریل گاڑی نہ صرف بند کر دی اور عوام کو ایک بہتر پرسہولت اور دل خوش کرنے والے سفر سے محروم کر دیا بلکہ ریل کی پٹڑیاں بھی اُکھاڑ کر لے گئے۔ تاکہ ریلوے سروس کی بحالی کا خدشہ نہ رہے۔ بے چارے لوگ ویگنوں اور بسوں میں دھکے کھاتے پھریں اور اپنے گوڈے چھلواتے رہیں۔ کیونکہ ہم نے تو ٹرانسپورٹ مافیا اور اڈہ مافیا کی تجوریاں بھرنی تھیں۔ یہ ظلم اور قومی وسائل پر یہ ڈاکہ تو سرداروں کے دور میں بھی نہیں پڑا تھا۔ معلوم نہیں ہم خدا کو کیا جواب دیں گے۔

پاکستان کے ممتاز اور معروف نعت گو شاعر

محمد امین ساجد سعیدی کو اس سال 2021ء میں

12 ربیع الاوّل کو ان کے نعتیہ مجموعے

تجلی حُسنِ ازل

کو صوبائی سیرت ایوارڈ ملنے پر

مبارک باد (ادارہ)

فنافی النعت راجا رشید محمودؒ

ڈاکٹر شاکر کنڈان/ سرگودھا

آج سے تقریباً پچیس سال پہلے میں کسی حوالے سے راجا رشید محمود کا نام، رابطہ لکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر ناصر رانا میرے پاس تشریف فرما تھے۔ انہوں نے مجھے فوراً روک دیا کہ

''ہ'' سے نہیں ''ا'' سے راجا لکھو کیوں کہ راجا رشید محمود ہمیشہ ''ا'' سے راجا لکھتے ہیں اور ''ہ'' سے لکھنے کو معیوب سمجھتے ہیں اور برا بھی مانتے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب راجا صاحب سے میری خط و کتابت کی ابتدا تھی۔ ماہ نامہ نعت اُس زمانے میں اپنے عروج پر تھا۔ بل کہ ماہ نامہ نعت اپنے آغاز سے ہی وہ مقام حاصل کر چکا تھا جو بعض رسائل مدتوں جاری رہنے کے بعد بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ ''نعت'' کا پہلا شمارہ جو حمد یہ تھا اپنے اندر اتنی جاذبیت اور دل کشی رکھتا تھا کہ وہ کسی صورت کسی بھی مجلّہ کا پہلا شمارہ نہیں لگتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ اسے جاری کرنے کے لئے مدتوں سوچا گیا ہے اور پوری حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی سے اسے جاری کیا گیا ہے۔ اس شمارے میں راجا رشید محمود کے والدِ گرامی جناب راجا غلام محمد کا بھی مضمون شامل تھا۔ گویا عشقِ مصطفیٰ ﷺ چھوٹے راجا صاحب کو ورثے میں ملا تھا اور آپ نے اسے نہایت ایمانداری اور محبت سے آنے والی نسلوں کو منتقل کیا۔ نعت کے حوالے سے راجا رشید محمود اور ان کے گھر والوں کی عقیدت اور محبت کو دیکھ کر میں نے آپ کو کچھ خطوط میں خانوادۂ نعت سے بھی مخاطب کیا تھا۔ نعت کے اس پرچے کو نکالنے، سجانے، سنوارنے اور جاری رکھنے میں آپ کی اولاد شہناز کوثر، راجا اظہر محمود اور راجا اختر محمود نے اپنی پوری صلاحیتیں اس کے لئے وقف کر دیں اور راجا رشید محمود کو اکلاپے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اسی طرح آپ کے والدِ گرامی جب تک حیات رہے نعت کے فروغ کے لئے اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ راجا صاحب نے نعت گوئی کی طرف مائل ہونے پر والد صاحب کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا شکر ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اپنے رب کا اس لئے شاکر رہا کرتا ہوں میں
اک غلامِ مصطفیٰؐ کے گھر مجھے پیدا کیا

(غلامِ مصطفیٰ ﷺ آپ نے اپنے والد کے نام غلام محمد ﷺ کی نسبت سے بھی استعمال کیا ہے)

ایک وقت تھا کہ مائیں بچوں کو جب لوری دے کر سلایا کرتی تھیں تو عام طور پر کوئی حمد یا نعت گنگنایا کرتی تھیں جس سے بچہ پُر سکون ہو کر نیند کی آغوش میں چلا جایا کرتا تھا۔ مائیں اس پر یقین رکھتی تھیں کہ اللہ اور اُس کے محبُوب کے ذکر سے اس طرح بلائیں ٹل جایا کرتی ہیں۔ اس لوری کا بچے کے ذہن اور اُس کی تربیت پر بھی اثر پڑتا تھا۔ گویا حمد یا نعت کی صورت میں گنگنائی جانے والی یہ لوری پنگھوڑے یا ''گھگھوٹی'' میں لیٹے اُس بچے کے لئے گھٹی یا ماں کے دودھ کی سی اہمیت رکھتی تھی جس کے اثرات مدتوں تک قائم اور برقرار رہتے ہیں جس میں ایمان کی رچاوٹ ہوتی ہے۔ راجا رشید محمود اپنی ایک نعت میں لوری کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

نعتوں کی لوری والدہ نے دی مجھے جوں ہی
احقر کے قلب پر ہوا ایمان کا نزول

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نعت سے محبت اور تعلق آپ کی گھٹی میں شامل تھا اور آپ کو پنگھوڑے میں ہی یہ احساس دلایا جاتا رہا کہ زندگی نعت ہے اور نعت زندگی ہے۔ آپ کے والد اور والدہ کے ذکر کے ساتھ میں آپ کی والدہ کے کردار کو بھی آپ کی شخصیت کے بنانے اور اسے پروان چڑھانے میں شامل کر کے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ آج بھی اگر ایسی ماں ہو تو راجا رشید محمود پیدا ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ نپولین نے کہا تھا ''تم مجھے اچھی مائیں دو میں تمہیں بہترین قوم دوں گا''۔ ماں کی گود چوں کہ بچے کا پہلا مکتب ہوتا ہے اس لئے بچہ جو کچھ میں کی گود سے حاصل کرتا ہے وہ اُس کی پوری حیات کو احاطے میں لئے رکھتا ہے۔ اگر اُس بچے پر ماحول یا معاشرہ اثر انداز ہوتا بھی ہے تو لوری کے یہ اثرات اُس کچوکے لگائے رکھتے ہیں اور اُس کے ضمیر کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں۔

راجا صاحب نے پنگھوڑے سے نکل کر جب بچپن کا سفر اختیار کیا تو تب بھی نعتِ نبی ﷺ ہی اُن کے وردِ زباں تھی۔ نعت سے یہ محبت انہی لوریوں کی وجہ سے انہیں عطا ہوئی تھی۔ آپ جب شعور کی دنیا میں آئے اور لفظ جوڑ کر شعر کہنے یا پڑھنے کا آغاز ہوا تو وہ آپ کے بچپن کا زمانہ تھا۔ آپ اس عہد کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں

شعر بچپن میں بھی تھے میرے نبیؐ کی مدح میں
نعت سے میرا رہا ہے ابتدا سے رابطہ

ہر مسلمان کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے درِ محبُوبِ خدا پر حاضری کی سعادت نصیب ہو۔ ہر نماز کے بعد جب ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہیں تو اُس میں اِس خواہش کا اظہار بھی ہوتا ہے لیکن کب شنوائی ہوتی

ہے اور کب بلاوا آتا ہے اس سے آدمی کو اندھیرے میں رکھا گیا ہے۔ جب جب دل میں خواہش بڑھتی ہے تو جوش بھی موجیں مارنے لگتا ہے۔ پوری زندگی گزر جاتی ہے اس خواہش کو پورا ہوتے دیکھنے کی آس اور امید میں۔ وہ شخص جس نے بچپن سے حاضری کا تصور دل و دماغ میں بٹھا رکھا ہو۔ اُس کے شب و روز جدائی میں کیسے گزرتے ہیں۔ وہ جانتا ہے یا اُس کے دلوں کے راز جاننے والا اُس تڑپ کو جانتا ہے۔ راجا رشید محمود بھی شعور میں آنے کے بعد اسی حسرت کو دل میں لے کر زندگی کو گزار رہے تھے اور انہیں یقین تھا کہ ایک دن ضرور آئے گا جب صبح کا سورج روضۂ اطہر پر طلوع ہوگا۔ سو جو درخواستیں حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں بھیجی جاتی رہیں انہیں ۱۹۸۹ء میں شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔

خیالِ طیبہ تو دل میں رہا تھا ایک عرصے تک
مری عرضی نواسی میں رسائی کے ہوئی قابل

۱۹۸۹ء تک ماہنامہ نعت کو جاری ہوئے تقریباً پانچ سال ہو چکے تھے۔ گویا کم از کم ان پانچ سالوں میں تو راجا صاحب کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا ہوگا جب عرضی نہ بھیجی گئی ہوگی اور پھر یہ عرضی ایسی قبول ہوئی کہ ہر سال اور کبھی کبھی سال میں کئی کئی بار آقائے نامدار حضرت محمدِ مصطفیٰ ﷺ نے اپنے درِ اقدس پر حاضری کے لئے بلوایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم اور اُس کی عنایت ہے کہ اُس نے اپنے محبوب ﷺ کے ذاکر کو بار بار اپنے محبوب ﷺ کے در پر حاضری اور اسی بہانے سے اپنے گھر میں آنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس سے ایک نکتہ یہ حل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق سبحانہٗ اپنے محبوب کو یاد کرنے والوں کو بھی اپنی حد درجہ عنایات سے نوازتا اور اعلیٰ مقامات عطا فرماتا ہے۔ راجا رشید محمود نے اپنے نعتیہ اشعار میں بارہا اللہ کریم کی اس عنایت کا ذکر کیا ہے:

ہر سال میں نے فضلِ خدائے کریم سے
پائیں تمورِ شہرِ پیمبرؐ کی لذتیں

حضوری کا مجھے ہر سال مل جاتا ہے سندیسہ
میں دو دو بار خوش ہوتا ہوں طیبہ کا سفر کر کے

محمود بھی بخت کو داتاؒ کے نگر سے
کرواتا ہے ہر سال سفر آپ کا روضہ

میرا ہے تیس (۳۰) بار کا محمود تجربہ
کب خوش دلی سے جائے مدینے سے گھر کوئی

خواب تک میں جب مدینے کو لگے رہتے ہیں نین
کیا پڑے دل کو مرے، لاہور میں رہنے سے چین

تیس بار کا یہ تجربہ جنوری ۲۰۱۲ء سے پہلے کا ہے۔ اِس کے بعد وفات (۱۲/اپریل ۲۰۲۱ء) تک اللہ تعالیٰ نے ایسے کتنے تجربات سے نوازا ہوگا اور حضور ﷺ نے اپنے در پر حاضری کا اذن بخشا ہوگا اِس کا ریکارڈ خانوادۂ نعت کے پاس محفوظ ہوگا۔ مدینہ منورہ کے گلی کوچوں میں جو سکون اور امن ہے اِس کا ادراک مدینہ میں حاضر ہونے والوں کو ہی ہوتا ہے۔ دنیا میں سب سے پُرسکون اگر کوئی شہر ہے تو وہ شہر نبی ﷺ ہے اور ایک وجہ یہ بھی ہے بار بار کی خواہش کی۔ اذنِ باریابی پر راجا صاحب کچھ ایسی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں کہ خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ وہ اُس لمحے کی کیفیت کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

طیبہ جانے کی جو سنتا ہوں تو ناچ اٹھتا ہوں
اپنی رقصیدہ خرامی پہ مجھے ناز بھی ہے

اور پھر اُن کا کہنا:

ہم نے طیبہ کے تو یوں دیکھے نظارے سارے
قلب پر نقش ہوئے شہر کے نقشے سارے

جب نگاہیں آشنائے گنبدِ خضرا ہوئیں
پرتیں دل کی کھل گئیں اور من مرا اجلا ہوا

راجہ رشید محمود کو لاہور سے باہر کسی مشاعرے یا تقریب میں بہت کم دیکھا گیا ہے۔ شاید آپ داتاؒ اور داتا کی نگری سے بہت محبت کرتے ہیں۔ جس کا ذکر اوپر ایک شعر میں آچکا ہے کہ داتا نگر سے روضہ پاک تک کا سفر اُس روضے کی زیارت کی حسرت میں کیا جاتا ہے۔ مجھے اِس کا ذاتی تجربہ بھی ہو چکا ہے جو داتا صاحب سے آپ کو محبت ہے یا داتاؒ صاحب آپ سے محبت کرتے ہیں اور وہ یوں کہ مجھے آپ نے دو بار داتا صاحب کے مزار پر بلوایا۔ ایک بار حضرت داتا گنج بخشؒ کی نسبت سے منقبت کا مشاعرہ تھا اور دوسری بار دربار پر ہی نعتیہ مشاعرہ تھا۔ تمام شعرا کے لئے داتا صاحب کے مزار کا دروازہ کھولا گیا۔ ہم نے اندر (مزار) کے احاطے میں آپ کے توسّل سے دعائیں کیں اور فاتحہ کے نذرانے پیش کئے۔ راجا صاحب نے دوسرے شہروں کے اسفار اور اپنی تن آسانی کے حوالے سے خود ہی وضاحت کر دی ہے:

محمود کسی اور سفر سے تو ہے نالاں
ہر سال پہنچتا ہے مدینے یہ تن آساں

اِس کے برعکس میری پہلی ملاقات راجا صاحب سے لاہور میں نہیں بل کہ گجرات میں ہوئی تھی۔ آپ ایک کتاب کی تقریبِ پذیرائی کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔ اِس تقریب میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک گورے چٹے رنگ کا باریش نوجوان جس کے چہرے پر متانت اور صوفیانہ تاثر تھا بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ ملاقات پر پتہ چلا کہ اس نوجوان کا نام شہزاد مجددی ہے۔ راجا صاحب سے میری اس پہلی ملاقات نے برسوں کو اپنے حصار میں لیے رکھا۔ میں جب بھی لاہور جاتا تو میری خواہش ہوتی کہ آپ سے دفتر میں مل لیا جائے۔ کئی بار یہ کوشش کامیاب بھی رہی۔ میں آپ سے جب بھی ملا مجھے اپنے کسی بزرگ کی شفقت اور محبت کا احساس ہوا

۔آپ کی عنایات کا سلسلہ مجھ پر ایک مدت تک جاری رہا ۔ریٹائر منٹ کے بعد کچھ عرصہ تک ہمارے درمیان خطوط کا تبادلہ بھی ہوتا رہا اور ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں لیکن بعد میں میری غفلت اور مصروفیات کے باعث نیز ڈھلتی عمر کے سبب سے میری بہت سی خواہشات ادھوری رہ گئیں جن میں ملاقاتوں کا سلسلہ بھی تھا جو ماند پڑ گیا۔ذمہ داریوں کا بوجھ اور احساس بڑھ گیا۔خط و کتابت میں بھی بندش آ گئی۔حتیٰ کہ میں اپنے شہر تک محدود ہو کر رہ گیا۔

دسمبر ۱۹۹۶ء میں ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کا مرتبہ مجموعہ نعت ''ضلع اٹک کے نعت گو'' کو جب راجا صاحب نے ماہ نامہ نعت میں شائع کیا تو میں نے سوچا کہ جن شہروں میں ملازمت کے دوران میرا قیام رہا وہاں کے شعرا اور ادبا کی محبتوں کا مجھ پر حق ہے سو اسے ادا کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہو سکتا ہے۔ستمبر ۱۹۹۷ء میں ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ کا مرتبہ مجموعہ ''گجرات کے پنجابی نعت گو شعرا'' جب ماہ نامہ نعت میں شائع ہوا تو مجھے مزید حوصلہ ملا اور میں نے راجا صاحب کو ایک خط کے ذریعے اپنی خواہش سے آگاہ کیا۔انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور جلد مسودہ بھیجنے کی تاکید کی ۔ میں نے عساکرِ پاکستان کے حوالے سے مواد یک جا کیا۔شعرا کا تعارف لکھا اور مسودہ انہیں ارسال کر دیا جو نومبر ۱۹۹۷ء میں ''اردو نعت اور عساکر پاکستان'' کے نام سے ماہ نامہ نعت کی اشاعت کا حصہ بنا۔بعد ازاں میں نے پانچ ایسے مجموعے ترتیب دیئے جن میں سے ''نعت اور ضلع سرگودھا کے شعرا'' اگست ۱۹۹۸ء، ''کراچی کے نعت گو شعرا'' جنوری ۱۹۹۹ء، ''سندھ کے نعت گو'' دسمبر ۲۰۰۰ء، ''راول پنڈی شہر کے نعت گو'' دسمبر ۲۰۰۱ء، اور ''اسلام آباد کے نعت گو'' مارچ ۲۰۰۳ء میں ماہ نامہ نعت کے نمبروں کے رنگ میں شائع ہوئے۔

راجا صاحب نے ماہ نامہ نعت کے کئی خوب صورت اور اہم نمبر بھی شائع کیے جن میں ناموسِ رسالت کے لئے جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں کی نسبت سے بھی تھے۔

زندگیٔ جاوداں خالق نے کی اُن کو عطا
حفظِ ناموسِ پیمبرؐ میں جو گزرے جان سے

اُن شہدا کو آپ نے اپنے اشعار کے ذریعے خراجِ تحسین بھی پیش کیا اور اُن کو تاریخ میں امر کر دیا۔ موذی راج پال کو جہنم رسید کرنے والے غازی علم الدین شہیدؒ کے بارے آپ لکھتے ہیں ؎

غازی علم الدین کو بخشا زراہِ التفات
حفظِ ناموسِ نبی ﷺ کا ولولہ اللہ نے
حرفِ حق کہنے سے تھپکی پا سکو گے دوستو
غازی علم الدین سے یا زادۂ منصور سے

پنجاب کے گورنر ملعون سلمان تاثیر کو فی النار کرنے والے ممتاز غازی کے بارے رقم طراز ہیں ؎

حفظِ ناموسِ نبی ﷺ میں ایک موذی مار کر
ہو گیا ممتاز غازی کا بقا سے رابطہ

حضور نبی کریم ﷺ کے اہانت آمیز کارٹون شائع کرنے والے اخبار کے مدیر Henryk Broder پر حملہ کر کے اُس ملعون کو زخمی کرنے والے جرمنی کے شہر مونس گلاڈ باخ میں واقع اوشلو لے فیڈ ریائن یونیورسٹی کے چوتھے سمسٹر کے پاکستانی طالب علم جناب عامر چیمہ شہید کو راجا صاحب نے ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ؎

جاں جو ناموسِ پیمبرؐ پہ لٹائی اُس نے
کی گئی حضرتِ عامر کی حمیت تسلیم
ہے جب تک عامر و ممتاز جیسا اک جواں باقی
رہے گی حفظِ ناموسِ نبی ﷺ کی داستاں باقی

راجا رشید محمود کے پورے کلام کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس میں موضوعات کا اتنا تنوع ہے کہ کئی تحقیقی کام ہو سکتے ہیں ۔آپ کے کلام میں سیرت النبی ﷺ کے تمام موضوعات ملتے ہیں ۔عشقِ رسول ﷺ، ہجرتِ مدینہ، معراج النبی ﷺ، مغازی، قرآنی تلمیحات، تلمیحاتِ حدیث، خلفائے راشدینؓ، مجاہد صحابہ کرامؓ، اہلِ بیت کرامؓ، مناقب، سفر نامہ، شہیدانِ ناموسِ رسالت، حیات راجا رشید محمود، غیر مسلم شعرا کی نعتیہ شاعری، خواتین کی نعتیہ شاعری، مختلف اصناف، عصرِ حاضر اور نعت گوئی، نعت کے مختلف

پہلو، اور اس طرح کے بہت سے موضوعات تلاش کئے جا سکتے ہیں ۔جامعات کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس طرف بھی توجہ دیں اور ماہ نامہ نعت نیز راجا رشید محمود کی کتب کو سامنے رکھ کر اُن میں موجود مضامین اور موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھوائے جائیں تا کہ مختلف گوشے قارئین پر وا ہو سکیں ۔آخر میں راجا صاحب کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔ ؎

ایسا دیا نظامِ اخوت حضور ﷺ نے
ہوتی ہیں دور جس سے دلوں کی کدورتیں
اذنِ دیدِ روضۂ سرکار ملتا ہے اُسے
حاملِ چشمانِ بینا جو بشر اُن کا ہوا
میرے حضور ﷺ مظہرِ ربِّ غفور ہیں
آئی شعور تک یہ خبر لا شعور سے
لاریب ہماری جانوں سے، ہم سے بھی زیادہ مالک ہیں
بہبود ہماری کچھ ہم سے کب سوچتے ہیں کم سیّدنا
دربارِ مصطفیٰ پہ جو عاصی پہنچ گیا
توبہ کا اُس کے واسطے دروازہ باز ہے
شہرِ نبی ﷺ کو کیسے فراموش کر سکوں
جس کے طفیل میں نے بھی دیکھا خدا کا گھر

گفتگو کا چراغ (استاد گرامی: ڈاکٹر اسلم انصاری مختصر مونو گراف)

ڈاکٹر افتخار شفیع / ساہیوال

بہار رخصت ہو چکی تھی، آم کے درختوں پر کوئل کی نغمہ سرائی کا موسم آنے والا تھا، پیرانہ سالی کے دکھوں کی ماری فصیل شہر خود کو نئے سرے سے موسم کی شدتوں کو سہنے کے لیے تیار کر رہی تھی، بہاء الدین زکریا رحمہ اللہ علیہ کے روضے کی جالیوں سے جھانکتی کرنوں سے سورج بار بار آ کر منہ دھوتا تھا۔ اسی دوران ۳۰ اپریل ۱۹۳۹ء کے ایک روپہلے اور خوش گوار دن میں ملتان کے قدیم علاقے پاک گیٹ کی ایک حویلی میں حاجی قاسم علی انصاری کے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا، نومولود کا نام اسلم رکھا گیا۔ یہی اسلم بعد میں ادبی حلقوں میں ڈاکٹر اسلم انصاری کے نام معروف ہوا۔ انصاری صاحب کے اجداد ملتان کے قدیم باشندے تھے۔ جس مکان میں بچپن گزرا وہ گردونواح کے علاقے میں پھولوں والی حویلی کے نام سے مشہور تھا۔ خبر نہیں ریاست لوہارو کی اونچی مٹی والی حویلیوں کی طرح اس پھولوں والی حویلی کے صحن میں پھولوں سے لدے پودوں پر پنکھا جھلنے کا رواج تھا کہ نہیں البتہ یہ طے ہے کہ گھر کے مکیں گہری نیند کے جلو میں معطر خواب دیکھیں یا کتابوں کے لازوال خزانے سے اپنی باتوں کو خوشبو سے آراستہ کریں، ان کی نفاستیں ضرور مثال بنتی ہیں۔ اسلم انصاری کہتے ہیں: میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو میرا گھر ہر قسم کی علمی، ادبی اور تاریخی کتابوں سے اٹا ٹوٹ بھرا پڑا تھا۔ لیکن جس پہلی کتاب کو بغیر استاد کی مدد کے خود بہ خود پڑھنا شروع کیا وہ دارالاشاعت پنجاب (لاہور) کی شائع کردہ داستان امیر حمزہ کی ایک دل چسپ تلخیص تھی جو ابوالاحفیظ جالندھری کے زور قلم کا نتیجہ تھی (۱)۔

اسلم انصاری نے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۵۷ء میں ایمرسن کالج ملتان سے ایف۔اے اور ۱۹۵۹ء میں اسی تاریخی درس گاہ سے بی۔اے (آنرز) کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش انھیں لاہور کھینچ لائی، آغاز میں انھوں نے ایم۔اے انگریزی کے طالب علم کی حیثیت سے ایف۔سی کالج لاہور میں داخلہ لیا لیکن اسے ادھورا چھوڑ کر اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی چلے آئے، یہاں ایم۔اے اردو کے دوران میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور سجاد باقر رضوی جیسے اساتذہ غیر معمولی ذہانت، وسعت مطالعہ اور ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے انھیں اپنے شاگرد خاص کا درجہ دیا۔ بہ قول ڈاکٹر خورشید رضوی:

> اس وقت کے پرنسپل اور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عبداللہ اپنے علمی اور تنقیدی مضامین کچی پنسل سے لکھا کرتے تھے اور پھر مختلف نشانوں سے مربوط کرتے ہوئے، بین السطور اور حاشیوں پر پیچ و خم عبارتوں کا اضافہ کرتے چلے جاتے تھے۔ ان مضامین کی عبارتوں اور اضافوں کے ربط ضبط کو سمجھ کر سید صاحب کے حسب منشا انھیں صاف کر کے لکھ دینا عام کے کسی طالب علم کے لیے ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ یہ کام اسلم انصاری کے سپرد ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے موتیوں سے جڑے سواد خط میں اس خوبی سے ان مضامین کی تبییض کر دیا کرتے تھے کہ سید صاحب کا جی خوش ہو جاتا تھا۔ (۲)

اورینٹل کالج لاہور میں اسلم انصاری وولنر ہاسٹل میں قیام پذیر رہے۔ انھی دنوں میں ان کی ملاقات ناصر کاظمی سے ہوئی، یہ رسم راہ جلد دوستی میں بدل گئی، ناصر کاظمی کے مجموعہ کلام پہلی بارش کا عنوان اسلم انصاری کا تجویز کردہ ہے۔ اس مجموعے کی مسلسل غزلیں بھی ناصر کاظمی نے نوجوان اسلم انصاری سے متاثر ہو کر کہیں۔ ۱۹۶۲ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔اے اردو کے امتحان میں اسلم انصاری نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ کچھ عرصہ وہاں بہ طور لیکچرار کے تدریسی امور انجام دیے، اس دوران انھوں نے پی۔سی۔ایس کا امتحان پاس کر لیا لیکن تقرر نہ ہو سکا۔ ۱۹۶۶ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کی کی طرف سے انھیں لیکچرار شعبہ اردو منتخب کیا گیا۔ اس دوران میں وہ گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ اور گورنمنٹ کالج بھکر میں متعین کیے گئے۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۹ء تک وہ ملتان آرٹس کونسل کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر بن گئے، ۱۹۷۶ء میں ان کی بہ طور اسسٹنٹ پروفیسر ترقی ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں ایمرسن کالج ملتان بھیج دیا گیا۔ اپنی ریٹائرمنٹ تک وہ اسی کالج میں تدریسی امور انجام دیتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے اردو زبان وادب میں بہ امتیاز ایم۔فل اور پھر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد کچھ وقت سرائیکی ری سرچ مرکز میں بھی گزرا۔ ۲۰۰۹ء میں اسلم انصاری کی علمی وادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے انھیں تمغہ امتیاز سے نوازا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی شخصیت کی

بہت سی جہتیں ہیں۔ان کی دل چسپی کا وسیع میدان ہے ۔انھوں نے شاعری،تنقید وتحقیق،ترجمہ نگاری اوراقبالیات کے شعبے میں تخصص حاصل کیا۔نئی نسل کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ان کے اہم شاگردوں میں خالد مسعود خان ،سید ذوالکفل بخاری ،ڈاکٹر وحیدالرحمٰن خان ،ڈاکٹر جاوید اصغراور (بہ زعم خود) فقیرافتخارشفیع شامل ہیں۔ملتان میں مقیم اسلم انصاری کی علمی حیثیت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ان کی منظرعام پر آنے والی کتابوں کی ایک غیر حتمی فہرست یہ ہے:

۱۔ kafeez کے عنوان سے خواجہ غلام فرید کی منتخب سرائیکی کافیوں کا اردو ترجمہ (بہ اشتراک جیلانی کامران)

۲۔ خواب وآگہی (شعری مجموعہ)

۳۔ اقبال عہد آفریں (اقبالیات)

۴۔ نقش عہد وصال کا (شعری مجموعہ)

۵۔ فیضان اقبال (منظوم اقبالیات)

۶۔ چراغ لالہ (فارسی مثنوی)

۷۔ Lotus and the sand waves (Poems and Plays)

۸۔ شعروفکر اقبال (اقبالیات)

۹۔ تکلمات (علمی،ادبی اور تہذیبی کالم)

۱۰۔ بیڑی وچ دریا (سرائیکی ناول)

۱۱۔ نگار خاطر (فارسی مثنوی)

۱۲۔ ادبیات عالم مین سیر افلاک کی روایت (تنقیدی مضامین)

۱۳۔ اردوشاعری میں المیہ تصورات: مقالہ پی۔ایچ۔ڈی (تنقیدوتحقیق)

۱۴۔ چودھری افضل حق اوران کی تصنیف زندگی :سوانح اورفکری وفنی جائزہ (تنقیدوتحقیق)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی شاعری کا آغاز دور طالب علمی سے ہوا،اورینٹل کالج میں دوران تعلیم وہ مختلف مشاعروں میں شرکت کرتے رہے،ان دنوں کی ایک خوش کن یادشمع تاثیر مشاعرہ میں انور مسعود کے ساتھ اورینٹل کالج کی نمائندگی کرنا تھا۔اس مقابلے میں انور مسعود نے نظم اور اسلم انصاری نے غزل کے مقابلے میں حصہ لیااور کامیاب رہے۔اسلم انصاری کی اس غزل کا ایک شعر دیکھیں:

شرار زندگی بھی کیا چراغ زیر داماں ہے
بہاروں میں بھی گل شعلہ بجاں معلوم ہوتے ہیں

اسلم انصاری نے غزل کی صنف کو شاید ساٹھ کی دہائی میں بہ طور شاعر قبول کیا۔ان دنوں ہر طرف نظم کا شہرہ تھا۔اسلم انصاری نے چڑھتے سورج کو سلامی دینے کی بجائے وقتی دھندلکوں کو قبول کیا۔اسلم انصاری نے اردو اور فارسی غزل کہتے ہوئے کسی وقتی میلان کو قبول نہیں کیا۔ان کا شمار قدیم وجدید کے رجحانات کا اتصال کرنے والے شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کے ہاں غزل کا نیا طرز احساس زندگی کے مہذب اور سلجھے ہوئے انداز کا رچاؤ بھی نمایاں ہے۔اسی الگ تشخص کی وجہ سے راہ ومنزل کا شعور آغاز ہی سے ان کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔وہ عدمیت ونیستی کے تصور سے آشنا ہیں،اور ان کا یہ احساس تیسری دنیا کے مسائل ومعاملات سے لے کر خود ان کے داخلی کرب تک پھیلا ہوا ہے۔آگہی کے تجربات سے آشنا ہونے کے باوجود خوابوں کی فسوں کاری کے تجربات ان کے ہاں ایک نامیاتی کل بن جاتے ہیں۔نمونے کے چند اشعار دیکھیں:

وہ ملا تھا سرراہے پہ بہت لوگ تھے ساتھ
آج کی شام تو وہ شخص اکیلا ہوتا

عدم کی سمت سے سوئے وجود آتا ہوا
نیا جہاں ہو کوئی چشم دوربیں کے لیے

ہم بھی چند کھڑکیوں سے خواب چرا سکتے تھے
ہم بھی اس شہر کے کچھ چیدہ مکاں جانتے ہیں

اردو زبان وادب کے ایک استاد کی حیثیت سے اسلم انصاری نے لفظوں کی خوشبو کو قائم رکھا ہے۔ان کی نظموں میں فلسفیانہ تشکیک اور کرید محض واقعاتی نہیں بل کہ اس کو برصغیر کے ہندالمانی کلچر کے تناظر میں دیکھنا چاہیے،وہ ایک طرف تو میرا جی،ن۔م۔راشداور مجیدامجد کے سلسلے کے شاعر ہیں دوسری سمت سے ان پر بیدل عظیم آبادی اور علامہ محمد اقبال کے واضح اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔انصاری صاحب کی نظمیں ان کی غزل کا تکملہ یا منظوم حاشیہ نہیں۔اقبال کے وسیلے سے تو ایک الوہی انا کی جھلک بھی اس شاعری کے بطن میں دیکھی جاسکتی ہے۔ایک نظم تمام دکھ ہے میں گوتم بدھ کے ذریعے سے شاعر نے اپنا فلسفہ حیات پیش کیا ہے۔سدھارتھ مشرق کی اہم ترین شخصیات میں شامل ہے۔اس نظم کا خطاب عام لوگوں سے نہیں بل کہ الم آفریں تکلم سے من کی دنیا کو روشن کرنے والی نسل سے ہے۔شاعر زندگی کی دکھ بھری حقیقتوں کو بہ تفصیل بیان کرنے کے بعد گوتم کے ابدگیر لہجے میں زندگی کے اس راز کو یوں فاش کرتا ہے۔ یہاں شاعری کا انداز دیکھیں:

جدائی تو خیر آپ دکھ ہے ۔ملاپ دکھ ہے
کہ ملنے والے جدائی کی رات میں ملے ہیں، یہ رات دکھ ہے
یہ زندہ رہنے کا، باقی رہنے کا شوق یہ اہتمام دکھ ہے
سکوت دکھ ہے کہ اس کے کرب عظیم کو کون سہہ سکا ہے
کلام دکھ ہے کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے جو ماورائے کلام دکھ ہے
یہ ہونا دکھ ہے، نہ ہونا دکھ ہے، ثبات دکھ ہے دوام دکھ ہے
مرے عزیزو! تما م دکھ ہے

اُردو میں رباعیات معریٰ کا تجربہ اسلم انصاری کی ایک عمدہ کاوش ہے۔فارسی شاعری میں اسلم انصاری نے مختلف اصناف میں سخن گوئی کی ہے۔عالمی ادب میں شعرا کے فکری وتخیلی سفر کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ورجل کی منظوم داستان انیڈ، واقعہ معراج واسری ،ابوالعلا المعری کے رسالہ الغفران، شیخ محی الدین ابن عربی کی تصنیف فتوحات مکیہ ،عبدالکریم الجیلی کی الانسان الکامل ،محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال ،سجاد انصاری کے غیر مکمل ڈرامے روز جزا اور علامہ محمد اقبال کی جاوید نامہ جیسی کتابوں نے ایک خاص روایت کی بنیاد رکھی ہے۔اسلم انصاری کے ہاں اسی کا تسلسل نظر آتا ہے۔ان کی فارسی شاعری میں سیر افلاک کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی غزل میں فارسی کے اساتذہ کا خاص رنگ نمایاں ہے:

ایک جگہ مکالماتی انداز کی ایک فارسی غزل کے اشعار دیکھیے:

گفتمش : آخر چرا برہم شدی اے یار گفت
پرسشت بیجا ست ،گفتم این چنیں رفتار؟ گفت
دیدن ما بس بود اہل ہوس را گفتمش
عشق ما پیداست از گفتار واز کردار گفت

علامہ اقبال کے ذکر اور فکر کا مطالعہ بھی اسلم انصاری کے لیے ہمیشہ سے قابل کشش رہا ہے۔اقبال سے وابستگی کی یہ صورت منظوم ومنثور ،دونوں حوالوں سے ہے،نظم گوئی میں انھوں نے تمثیلی اور نیم تمثیلی انداز کو چنا ہے۔کہیں کہیں انھوں نے منظوم ریڈیائی تشکیل کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ناقدین وشارحین اقبال کے افکار وتصورات بھی ان کی شاعری کا موضوع بنے ہیں۔اسلم انصاری نے تفہیم اقبال کے لیے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، یوسف حسین خان، پروفیسر آرتھر آربری، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، الیزاندر بوسانی اور ڈاکٹر این میری شمل جیسی شخصیات سے استفادہ کیا ہے۔اقبال کی مسلم الثبوت شاعری رجائیت کی علم بردار ہے۔اپنی تحریروں میں ڈاکٹر اسلم انصاری نے فکر اقبال کے متعدد مخفی گوشوں کی تلاش کی ہے۔اقبال کی شاعری سے المیہ عناصر کی دریافت جسے وہ قومی تنزل کے باعث وجود میں آنے والی بیساختہ آہ سرقرار دیتے ہیں۔اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر این۔میری۔شمل کہتی ہیں: '

پروفیسر انصاری نے علامہ اقبال سے بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔جو مثنوی چراغ لالہ میں ظاہر ہوا ہے۔یہ ایک دل چسپ بات ہے کہ ان میں دوسرے شاعروں میں میرزا بیدل بھی شامل ہیں۔جنھیں اقبال اپنے پسندیدہ شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔یہ مثنوی جدید موضوعات کو زیر بحث لاتی ہے اور ان معاصرین پر نکتہ چینی کرتی ہے جو اپنے آپ کو سکون محض اور مرگ آفریں جدید فنون میں گم کر دیتے ہیں۔یہ مثنوی نسل نو کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ تاب ناک ماضی میں پیوست اپنی جڑوں کی طرف رجوع کرے۔(۳)

ڈاکٹر صاحب نے طویل عرصے تک ملک کے ایک قومی روزنامے میں ادبی کالم بھی لکھے، ان کالموں کو علمی حلقوں میں بہت پذیرائی ملی۔ان کالموں کا اسلوب شان دار اور عالمانہ ہے۔عام تر موضوعات کی اس انداز میں کی گئی مفصل تشریح ایک بالغ نظر انسان کو چونکا دینے کے لیے کافی ہے۔ایک معلم کی زندگی کے مختلف پہلو ہمیشہ دوسروں کے لیے مشعل راہ ہونے چاہیں۔ڈاکٹر اسلم انصاری نے تعلیم وتعلم کے سلسلے کو عبادت کے طور پر اپنایا، اور ایک خاموش طبع اور ہر دل عزیز استاد کا مقام حاصل کیا۔ہمارے اساتذہ کی اکثریت پڑھتی ہے نہ لکھتی ہے بس پڑھاتی ہے۔اساتذہ کے معاملے میں دو انتہاؤں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔بعض اساتذہ تدریسی نصاب کو ثانوی مرتبہ دیتے ہیں تو بعض اسی سے وابستہ ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔اسلم انصاری کے ہاں جس معلم کا سراغ ملتا ہے وہ دونوں میں ایک حد اعتدال پیدا کرتا ہے۔اتنا باکمال شاعر، صاحب علم ودانش مبتدیانہ سطح پر تعلیم دیتے ہوئے نصاب کو جس طرح دیکھتا ہے اس کی مثال دیکھیں:

ایک معلم کی تدریسی زندگی کے کئی پہلو چپکے ہی چپکے اس کے دل ودماغ پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔اعلیٰ ثانوی مدارج کے اردو لازمی کے نصاب میں جب بھی زندگی (از: چودھری افضل حق) کی کوئی کہانی شامل رہی مجھے ایک ان جانی سی مسرت حاصل رہی۔یہ کہانیاں میں نے برسوں نصاب میں پڑھائی ہیں۔اور ہر بار پڑھاتے ہوئے ایک عجیب سا لطف محسوس کیا ہے۔ہر بار میرا ذہن زندگی کی ادبی اور فکری قدر وقیمت کی طرف مبذول ہو جاتا رہا ہے۔میں نے

ہمیشہ محسوس کیا کہ اس کتاب کے اسلوب کا تجزیہ ہونا چاہیے اور اس کے فکری مافیہ کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے (۴)

ایک مصاحبے کے دوران سوال کا جواب دیتے ہوئے اسلم انصاری استاد، معلم اور مرشد کے مابین فرق کو کچھ اس طرح سے واضح کرتے ہیں:

دیکھا جائے تو معلم، مرشد اور مرشد، معلم ہوتا ہے۔ یہ اور بات کہ اصطلاحی مرشد کا دائرہ تعلیم تربیت اپنے مسترشدین (مریدین) کی اخلاقی اصلاح اور روحانی ترقی تک محدود ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے معلم ایک عمومی تصور اور مرشد ایک خاص صورت ہے۔ اگر استاد میں ایک خاص قسم کی خوبی ہو تو وہ استاد سے معلم اور معلم سے مرشد کا درجہ حاصل کر سکتا ہے (۵)

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ خود اسلم انصاری کے ہاں اقبال کا اثر و نفوذ ایک مرشد کے انداز میں دکھائی دیتا ہے، ان کے اہم اساتذہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ، سجاد باقر رضوی، تاج محمد خان اور ملک بشیر الرحمن خان کے بعد جس استاد نے ان کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ سید علی عباس جلال پوری ہیں۔ طالب علم کلاس روم کے ماحول سے ایک خاص قسم کا لطف کشید کرتا ہے۔ ایک مثالی طالب علم .ن بعد میں قابل تقلید استاد کا درجہ اختیار کر سکتا ہے۔ انصاری صاحب کی بی۔اے۔ کی کلاس میں استاد علی عباس جلال پوری جب اپنی پوری فلسفیانہ تھیوری کے ساتھ آن کھڑے ہوئے تو شاگرد اسلم انصاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، یہاں تک کہ اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ فلسفہ بھی اس کا پسندیدہ مضمون ٹھہرا:

کلاس روم میں علی عباس صاحب (سید علی عباس جلال پوری) کے حضور ہم بہت دیر سے آئے، پہلے دن انھوں نے ہمیں دیوان غالب کی ردیف ی کی یہ غزل پڑھائی: سرگشتگی میں عالم سے یاس ہے/ تسکیں کو دے نوید کے مرنے کی آس ہے۔ فلسفے کا پس منظر رکھنے والے استاد کے لیے غالب کی غزل کی تدریس کچھ اور ہی معانی رکھتی ہے۔ سید صاحب نے ہمیں یہ غزل کچھ اس انداز سے پڑھائی کہ ہم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ادب اور شاعری کی تدریس میں پہلی بار نفسیات اور فلسفے کی اصطلاحات کا استعمال ہمارے لیے حیرت کا باعث بھی تھا اور انشراح خاطر کا سبب بھی (۶)

ہمارے نظام تعلیم کے محاسن و معایب اپنی جگہ لیکن مادیت پرستانہ معاشرے کا ایک تحفہ استاد اور شاگرد کا کمزور ہوتا ہوا رشتہ بھی ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شاگرد احترام استاد کے بغیر استاد کے فیضان نظر سے محروم رہتا ہے۔ اس طرح استاد بھی شاگردوں کے لیے عمومی شفقت کے رویے کے بغیر اس روحانی لذت اور قلبی راحت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا جو پڑھانے کے عمل کا لازمی ثمرہ ہوتا ہے۔ معلم اور متعلم کے معدوم ہوتے رشتوں کی بحالی کی صورت یہی ہے کہ شفقت اور احترام کے دوطرفہ توازن کو بحال کیا جائے (۷)

ڈاکٹر اسلم انصاری کی شخصیت کی ان مختلف زاویوں کو چند صفحات پر سمیٹنا ممکن نہیں۔ ان کا پھیلاؤ دور رس اور ادراک گہرا ہے۔ وہ اپنے عہد کی ذاتی اور اجتماعی صداقتوں کے ترجمان ہیں۔ ان کے ہاں گہری عصری بصیرت دکھائی دیتی ہے۔ مشرقی اقدار کے رسیا اور مذہبی افکار کے شیدا اسلم انصاری مسلم تہذیب و تمدن اور اسلامی آئیڈیالوجی سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ انھوں نے بڑی خاموشی سے شعر و سخن کی دنیا میں نیک نامی حاصل کی ہے۔ ان کا تعلق ملتان سے ہے لیکن ان کے افکار و نظریات کے اثرات قومی سطح پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ ملکی منظر نامے میں تاریخ و ثقافت کے حوالے سے جو مقام ملتان کو حاصل ہے، اسلم انصاری کو اپنے ہم عصروں پر وہی فوقیت حاصل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اسلم انصاری، تکلمات، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸
۲۔ جاوید اصغر، ڈاکٹر، گفتگو کا چراغ، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲
۳۔ افتخار شفیع محمد، اسلم انصاری، شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۵
۴۔ اسلم انصاری، تکلمات، ص ۱۸
۵۔ ایضاً، ص ۱۸
۶۔ ایضاً، ص ۱۸
۷۔ ایضاً، ص ۱۸

حسن عباسی کا حمدیہ مجموعہ ''صاحب''

نسیم سحر/ راول پنڈی

کسی بھی مسلمان بچّے کے کان میں پیدائش کے فوراً بعد جو پہلی آواز اذان کی گونجتی ہے اُس کا پہلا لفظ ہی اللہ اکبر ہے گویا اللہ کی کبریائی کے اعتراف ہی سے ہر مسلمان کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور پھر یہی جذبہ بشرطِ توفیق ہر مسلمان شاعر سے حمد کہلواتا ہے۔ ''حمد'' کا لفظ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی تعریف وثناء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کسی اور کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔ سینئیر نقاد اور شاعر جناب ڈاکٹر عزیز احسن کہتے ہیں:

''شعراء جب حمدیہ شاعری کرتے ہیں تو اُن کے سامنے اگر اپنے مسائل ہوں تو وہ دُعا یا مناجات کا انداز اپناتے ہیں۔ اگر کائنات کی تخلیق کے حوالے سے خالق کی عظمتوں کی طرف دھیان جائے تو اشیائے کائنات کے جزوی ذکر کے ساتھ خالق کی عظمت کا اعتراف شعروں میں ڈھل جاتا ہے، اور اگر خالق کی طرف سے مخلوق کو ملنے والی نعمتوں پر شکر کرنے کا جذبہ غالب ہو تو جذباتِ تشکّر شعری متن میں ڈھلتے ہیں''۔

حمد ونعت پر مبنی شاعری ہر اچھے مسلمان شاعر کے ایمان کا جزو ہوتا ہے۔ لیکن عجیب سی بات ہے کہ کئی عشروں تک حمد ونعت کو صرف عبدیت اور عقیدت کا اظہار سمجھا جاتا رہا اور اسے ایک صنفِ ادب کے طور پر جگہ نہیں ملی۔ اردو کی شاعری میں نعت تو پھر بھی کسی حد تک لکھی گئی مگر حمد کی جانب بہت کم شعراء نے توجہ دی۔ محافل میں بھی حمد خوانی خال خال ہی دیکھنے میں آئی۔ بہت سے حمد ونعت سے جڑے ہوئے تنقید نگاروں اور شاعروں نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ حمد اس لیے رائج نہ ہو سکی کہ محفل یا تقریب کا آغاز جب آیاتِ قرآنی کی تلاوت سے ہوتا تھا تو اس کے بعد حمد پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی البتہ نعت کو ضرور جگہ ملی۔

تاہم مقامِ شکر ہے کہ گذشتہ چند برس سے حمد کی جانب شعرائے کرام نے توجہ دی ہے۔ محامد پر مشتمل بیشمار کتب بھی شائع ہو رہی ہیں۔ گذشتہ دنوں جب ایک کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے راقم السطور نے حمد گوئی کے موضوع پر مقالہ لکھا تو محض پنجاب ہی سے شائع ہونے والے نعتیہ مجموعوں کی تعداد ساٹھ سے زیادہ نکلی جبکہ پاکستان بھر سے شائع ہونے والے خالص حمدیہ مجموعوں کی تعداد کسی طور بھی ایک سو سے کم نہیں۔ تحقیق پر یہ بھی معلوم ہوا کہ نہ صرف سینئیر شعراء نے بلکہ نوجوان نسل کے شعراء نے بھی بڑی عمدہ حمد گوئی کی ہے اور اُن کے بھی حمدیہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آج قارئین سے ایک ایسے ہی نئی نسل کے نوجوان شاعر کا تعارف کرایا جا رہا ہے جس کی تا حال ایک نہیں بلکہ دو حمدیہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کے عنوان 'سائیں' اور 'صاحِب' ہیں۔ اس تبصرے کا موضوع اُن کا دوسرا حمدیہ مجموعہ 'صاحب' ہے، جو کہ ۲۰۱۸ء میں نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں 'صاحب' کو ردیف بنا کر محامد کہی گئی ہیں۔ اور کہیں کہیں صاحب کے ساتھ سابقہ یا لاحقہ بھی لگایا گیا ہے مثلاً صاحب کا، صاحب سے، صاحب کی، صاحب بے نیاز، صاحب جی، وغیرہ۔ یہ تمام محامد ایک بحر میں نہیں بلکہ شاعر نے حسبِ ضرورت مختصر یا طویل بحریں استعمال کی ہیں۔ اس کی ضخامت ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق کے اندر کا پہلا ہی شعر شاعر کی تخلیقی وسعت کا اعتراف کرنے پر مجبُور کر دیتا ہے:

دل پہ کوئی بھی تھاپ ہے صاحب
آپ ہی کا الاپ ہے صاحب

حسن عباسی نے ''صاحب'' کے لفظ کو پورے ادب واحترام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ایسے خوبصورت اور اچھوتے شعری پیکروں میں ڈھالا ہے کہ اُن کی تخلیقی زرخیزی کی داد دینا پڑتی ہے۔

اس کتاب پر پیش لفظ یا تقاریظ لکھنے والوں میں سینئیر اور معروف شعراء شامل ہیں جن میں بشریٰ رحمٰن، نذیر قیصر، لطیف ساحل اور لبنیٰ صفدر شامل ہیں۔ بشریٰ رحمٰن جیسی ادیبہ، شاعرہ، افسانہ نگار، ناول نگار اور دانشور نے اس کتاب کے پیش لفظ میں کیا خوب لکھا ہے: ''عشق تو بس ایک ہی ہے۔ 'صاحب' کا عشق۔ جسے نصیب ہو وہ صاحبِ دل بن جاتا ہے، صاحبِ حال اور صاحبِ قال ہو جاتا ہے''۔۔ اور صاحب کے لفظ کی سَنَد میں کہتی ہیں ''نعتیہ شاعری میں اِس سے پہلے برِّصغیر کے صوفیائے کرام نے بلکہ عربی اور فارسی کے صوفی شاعروں نے بھی صاحب کی اصطلاح کو معنوی اور لغوی اعتبار سے سجا اور بنا کر پیش کیا ہے۔'' جدید صاحبِ اسلوب شاعر نذیر قیصر شاعرانہ انداز میں لکھتے ہیں: ''۔۔ 'صاحب کی شاعری میں خدا حاکم نہیں، دوست ہے، خدا بادشاہ نہیں، بزرگِ برتر اور صوفی ہے، اور مولانا روم کی زبان میں خدا پیالہ نہیں پانی ہے۔۔ سچّا شاعر صوفی ہوتا ہے جو زمینوں اور آسمانوں کے درمیان پرندے کی طرح سفار تکاری کرتا ہے''۔ اسی طرح معروف شاعر ایوب خاور کتاب کے عنوان کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''۔۔ 'صاحب' صرف کتاب کا عنوان ہی نہیں ساری کی ساری حمدوں کی ردیف بھی ہے۔۔۔ ہم دن میں کئی مرتبہ عقیدتاً اپنے عجز وانکسار کا اظہار کرنے کے لیے

کہتے ہیں اللہ مالک ہے۔ 'صاحب' میں خود ایک ایسی جدت ہے جو کم از کم میں نے کسی حمدیہ مجموعے میں نہ دیکھی نہ پڑھی''۔ ایک اور معروف شاعر لطیف ساحل نے ان الفاظ میں اظہارِ رائے کیا ہے: ''حسن عباسی کے اِس حمدیہ کلام میں الفاظ کی دروبست بھی نویکلی ہے اور الفاظ بھی منفرد ہیں۔۔ اُس کی حمدیہ شاعری پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ اُسے اللہ تعالی کی مصاحبت راس آ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے کلام کو قبولیت کے شرف سے نوازا ہے''۔ حسن عباسی کی شریکِ حیات لبنیٰ صفدر، جو خود بھی ایک عمدہ شاعرہ ہیں،

یوں ان کے شعری انداز کی تعریف کرتی ہیں'' حسن عباسی کی رومانوی شاعری کا عکس حمد میں بھی پوری طرح اُجاگر ہے۔۔ اختراع، خوش بیانی اور جذبہ انگیزی کے کیسے کیسے پھول اور پھول بھی انتہائی دلکش اور خوش رنگوں والے کھلے پڑے ہوئے ہیں۔ 'صاحب' شاعری ہی نہیں بلکہ وہ اندازِ تکلم ہے جو براہِ راست اپنے خدا سے ہے''۔

حسن عباسی اس عہد کے شاعر ہیں اور اس عہد میں رائج لفظیات سے بھی حمد گوئی میں ایک الگ انداز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسے ایسے مضامین باندھتے ہیں جواب سے پہلے حمد میں تو کیا، شاید غزل میں بھی نہیں استعمال ہوئے ہوں گے۔ اُن کی خدا سے ہم کلامی کا ایک جدید انداز دیکھیے:

اتنے مشکل کیوں کرتے ہو مسیج صاحب
آخر کتنا رکھتا ہوں مَیں نالج صاحب؟

انہوں نے کئی دیگر محامد میں انگریزی کے الفاظ بڑی سہولت اور خوبصورتی سے استعمال کیے ہیں، ایک ایسا ہی حمدیہ شعر دیکھیے::

آپ کا اسم آخری منزل
اسم پہلا سٹاپ ہے صاحب

حسن عباسی کی حمد گوئی کا اسلوب کچھ ایسا ہے کہ کہیں کہیں قاری بلکہ نقاد بھی چونک جاتا ہے کہ یہ گلے شکوے کسی انسان سے ہو رہے ہیں یا اللہ تعالی سے، مگر حسن عباسی کے پاس یہی جواز ہے کہ جب اُس نے اللہ کو 'صاحب' مان لیا تو پھر وہ ایک عام انسان کی طرح ایسے گلے شکوے کرنے اور ایسے ہی اسلوب میں اپنی محبت کا اظہار کرنے کا حق بھی رکھتا ہے۔ اس نے روزمرہ کی زندگی کے تمام مسائل، تمام دکھ درد اپنے صاحب سے بے تکلفی کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ اور کہیں کہیں اللہ کی بڑائی اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ خدا کا نائب ہونے کا بیان بھی ایک منفرد دلیل کے ساتھ کیا ہے:

خود پہ ایمان کیوں نہ لاؤں میں
میرے اندر کتاب ہے صاحب

وہ ایک ادبی جریدے ''ارژنگ'' کا مدیرِ اعلیٰ بھی ہے، اور ناشر بھی، اِس لیے اس نے ایک شعر یوں بھی کہا:

چیدہ چیدہ لوگ اسے پڑھ سکتے ہیں
چھپتا ہے محدود شمارہ صاحب کا

اس کے اس حمدیہ مجموعے میں کچھ خالص حمد کے شعر بھی اپنے جداگانہ اسلوب کے سبب اپنی طرف کھینچتے ہیں:

حمد لکھ کر بھی کم نہیں ہوتی
مجھ میں کیسی بھڑاس ہے صاحب
حمد کیا کرتے ہیں باری باری صاحب
کالے تیتر سے ہے اپنی یاری صاحب
حمد لکھتا ہوں روز پانی پر
گھر کے پہلو میں جھیل ہے صاحب
حمد میں دِل کی بات کر لینا
اپنا طرزِ سخن ہے صاحب جی
آپ کا نام لکھنے کی خاطر
سیکھتا ہوں میں خوش خطی صاحب
وضو سے اتری تھکن ہماری
نماز میں نیند آئی صاحب

اور 'صاحِب' کی ردیف میں کئی بحروں میں حمد نگاری کرتے ہوئے اگر اُسے کہیں احساس ہوا ہے کہ وہ روایتی حمد گوئی سے ذرا ہٹ گیا ہے تو اس نے کسی نقاد کے خوف یا 'خوفِ فسادِ خلق' کے تحت اپنے ایسے اشعار اس حمدیہ مجموعے سے خارج نہیں کیے بلکہ انہیں پورے اعتماد کے ساتھ شامل کیا ہے کہ الفاظ کے عمیق مفاہیم میں اترنے والے اور وسیع تر ویژن رکھنے والے نقاد اور قاری انہیں رد نہیں کر سکتے:

صرف کانٹے نہیں ہیں پیروں میں
سر کے اندر بھی کیل ہے صاحب
لاڈ اور پیار نے بگاڑا ہے
آپ کی ساری ڈھیل ہے صاحب
درگزر کی اپیل ہے صاحب
اشک میرا وکیل ہے صاحب

خود حسن عباسی اس مجموعے کے آخر میں اپنے نثری نوٹ میں کہتا ہے ''یہ خدا کے حضور نیا گیت ہے جو انسان اور خدا کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ حمد مکمل عقیدت ہے، محبت میں گندھی ہوئی عقیدت، اور شکوہ کے بغیر محبت ناممکن:

شکوے ہوں گے ہزار صاحب سے
ہو گیا ہم کو پیار صاحب سے
یہی میری حمد ہے۔۔''

اور واقعی 'صاحِب' میں ہر شعر پڑھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ یہی حسن عباسی کی حمد ہے۔ سلامت رہو حسن عباسی کہ تُم نے حمد گوئی کو ایک نیا آہنگ اور انداز عطا کیا ہے۔

مکافاتِ محاورات

امجد محمود چشتی/ میاں چنوں

بے شک زمانے میں تغیرات کو کمال کا ثبات ہے اور وقت کے ساتھ اقدار، روایات سب کچھ بدلتا رہتا ہے۔ ایسے میں اردو محاورات وضرب الامثال بھی مکافات سے دو چار کیوں نہ ہوں ۔ آیئے چند محاورات کی بات کریں جن کے مفاہیم بدل چکے ہیں اور اب یوں لکھنے اور پڑھنے میں مضائقہ نہ ہوگا ۔

۱۔ چراغ تلے اجالا: گئے وقتوں میں رات کو روشنی کیلئے استعمال ہونے والے دیئے، چراغ، لیمپ اور لالٹین کی بناوٹ ہی ایسی تھی کہ ان نیچے اندھیرا رہتا تھا اور باقی ماحول روشن رہتا۔ مگر آج کے الیکٹرک چراغوں کا معاملہ الٹ ہے اور ان کی روشنی کا رخ نیچے ہوتا ہے ۔ بلکہ اکثر کے سر پر کیپ ہونے کے موجب چراغوں کے اوپر اندھیرا چھایا رہتا ہے۔

۲۔ علاج پرہیز سے بہتر ہے: بیماریوں اور حالات کی ابتری سے بچنے کیلئے حفظ ماتقدم سماجی عقیدے کی مانند تھا۔ تاہم آج کے تیز مشینی دور میں اتنا وقت، صبر اور قناعت کہاں؟۔ اب کون وسائل کے ہوتے ہوئے ہمہ وقت معاذ اللہ کہتا پھرے۔ جو دل میں ہو وہ کر گزرنا پریسٹیج ہے۔ گر آنچ وآنے کا اندیشہ جنم لے تو وسائل سے آسان حل ڈھونڈے جاسکتے ہیں ۔ مثلاً رشوت لیتے پکڑا گیا شخص رشوت دے کر چھوٹ سکتا ہے تو پھر رشوت لینا کیوں چھوڑا جائے ۔۔ اسی طرح جو کھانے کو جی مانگے کھاتے جاؤ۔ کچھ ہوا تو میڈیکل کی حیرت انگیز سہولتیں کس لئے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اس دور میں پرہیز کے نام پر کڑھنے سے یہ یقین رکھنا بہتر ہے کہ اللہ نے ہر مرض کا علاج دنیا میں رکھ دیا ہے۔

۳۔ اتفاق میں ٹینشن ہے: مل جل کر کام کرنا اور زندگی گزارنا باعثِ برکت وسہولت تھا ۔ پرفی زمانہ مشترکہ خاندان اور اکٹھ بھی کا منہ چڑاتا ہے۔ ایک ہی کمرے میں ہنسی خوشی رہنے والوں کو اب الگ الگ کمرا اور پرائیویسی درکار ہے۔ خودمختاریوں کو خطرات لاحق ہیں اور جوائنٹ فیملی میں چھپ چھپ کر اپنے کمروں تک گرہستی وماکولات کی رسد نہائت تکلیف دہ امر ہیں۔ لہٰذا اب اتفاق میں شدید ٹینشن پنپتی ہے اور علیحدگی پسند ساسیں، دیورانیاں اور بہوئیں اس محاورے کو منطقی انجام تک پہنچانے کیلئے برسرِ پیکار ہیں۔

۴۔ جو سکھ بازارے، نہ گھر نہ چوبارے: دورِ حاضر میں اپنے گھر کی نسبت دوسروں کے گھر اور چوک بازار دل کو زیادہ لبھاتے ہیں۔ تقریب پسند احباب کے ہاں گھر بیٹھنا اور گھر سے کھانا دقیانوسی علامات ہیں ۔ بقول شاعر: ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا کئی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کے

۵۔ نہ ہوگا نو من تیل، رادھا پھر بھی ناچے گی: اس محاورے کے معانی کسی کام کیلئے انتہائی مشکل شرط رکھنے کے ہیں ۔ لیکن آج بھلے پلے دھیلا بھی نہ ہو ،میلا دیکھنے کے جنون معراج پہ ہیں ۔ اپنے ہاں تو یہ کچھ زیادہ ہی صادق ہے اور یہاں رادھائیں تیل گیس بجلی اور غذا کی حالتِ زار کے باوجود ناچنے پہ آمادہ بلکہ بضد ہیں۔

۶۔ لالچ بری جزا ہے: اب لالچی کتے کا فلسفہ بھی بدل چکا ہے اور لالچ کو کچھ حاصل کرنے کے لئے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ورنہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے قناعت کئے بیٹھنے سے کچھ نہیں ملتا ۔ ترقی اور آگے بڑھنے کیلئے لالچ بجا ہے۔

۷۔ اب پچھتائے کیا ہووت جب ایک رہا نہ پیچ: وطن عزیز میں پیچ یا صفحہ کو تقدیس حاصل ہے اور ایک پیچ پر ہونا سعادت وبقا کی علامت ہے۔ مگر لاکھ احتیاط کے باوجود اس پیچ سے بندہ پھسل کر تختہ دار، بی ہائینڈ دا باریا آر یا پار بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا پیچ پر قدم جمانے کیلئے دن رات ایک کرنا لازم ہے ۔ پیچ ایک نہ رہنے کی صورت میں پچھتانا مطلقاً بے سود ٹھہرتا ہے۔

۸۔ بندر کی بلا، طویلے کے سر: ماضی میں طویلے میں رکھے گئے گھوڑوں کو وباؤں سے بچانے کیلئے باہر بیٹھا بندر وبا کا شکار ہوتا مگر اصطبل محفوظ رہ جاتا تھا۔ پر اب بڑے لوگ خود کو بچانے کیلئے پوری قوم کی قربانی دیتے ہیں۔ ایک مچھلی سارے جل کو خراب کرتی ہے۔ اسے سیاست سے جوڑنا ہرگز مناسب نہ ہوگا۔

۹۔ ہنوز تبدیلی بسیار دور است: دلی واقعی دور تھا اور اب بھی ہے مگر تبدیلی آنے کا یقین کامل تھا۔ خوب پرکھنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ نہ صرف تبدیلی دور است بلکہ تبدیلی ہمارے گھروں اور اداروں میں بال کھولے سو رہی ہے ۔

۱۰۔ بیڑا کھا جانا: پرانے دور میں بادشاہ کسی اہم ذمہ داری کی تفویض کیلئے عمال کو بلاتا اور ان کے سامنے بیڑی کے پتے پھیلا کر دریافت کرتا کہ یہ مہم کون ذمہ لے گا۔ جو پتا اٹھا لیتا اسے وہاں بھیج دیا جاتا۔ گویا یہ محاورہ کسی اہم ذمہ داری لینے کے لئے بولا جاتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ جو تمیں مار کسی کام کا بیڑہ اٹھاتا ہے، بیڑا ہی خود کھا جاتا ہے۔

۱۱۔ ایک بیمار سو انار: کسی قیمتی چیز کے متعدد امیدوار ہو سکتے ہیں۔ یہ محاورہ اس لحاظ سے اب بھی درست سہی پر کہیں کہیں یہ بھی مکافات کا شکار ہے۔ جیسے کوئی گمبھیرتا پیش آجائے یا کوئی بیمار ہو تو ہزاروں مشورے، حل اور نسخے ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کا واضح ثبوت سوشل میڈیا پہ کھلے بندوں دستیاب ہے۔

۱۲۔ نیکی کر، فیس بک پہ ڈال: حکم ہے کہ نیکی اور احسان کی کسی کو بھنک بھی نہ پڑے پر آج معمولی سی نیکی بھی اس واسطے سرزد ہوتی ہے کہ سوشل میڈیا کی نذر کی جاسکے اور خوب ڈھنڈورا پیٹا جاسکے۔

علی سیاف کے اُردو ناول ''عالیہ'' کا ایک سرسری جائزہ

پروفیسر رانا محمد یعقوب

انسانی جذبوں کے اظہار کا فن روز ازل سے انسان کے ساتھ ساتھ مختلف اصناف کی صورت میں موجود رہا اور حیات انساں کے صدیوں پر محیط ارتقائی سفر میں اس کا ہم رکاب و ہم سفر بھی۔ ناول کی صنف اگرچہ ادبیات مغرب سے اردو زبان و ادب کا حصّہ بنی لیکن ڈیڑھ صدی کے ارتقائی سفر کے بعد اردو ناول آج ہمیں بین الاقوامی سطح پر خطے کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ناول کو حیات انساں کی تعبیر بھی کہا گیا ہے اور انسانوں جذبوں کی تفسیر بھی ،اس صنف کو پاکٹ تھیٹر بھی قرار دیا گیا اور چاول کے دانے پر تصویر کشی بھی۔ رالف فاکس نے ناول کو دور حاضر کی رزمیہ نگاری کا فن قرار دیا۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے ناول کو گلیلیو کی دوربین سے بڑی ایجاد قرار دیا۔ پریم چند کے خیال میں ناول انسانی کرداروں کی مصوری ہے۔ ای۔ چیمبرز کے نزدیک ناول ایک ایسی طویل بیانیہ نثر ہے کہ جس میں حقیقی زندگی پیش کی جاتی ہے اور ایڈمنڈ برک کے خیال میں ناول حقیقت سے بھی آگے کی چیز ہوتی ہے۔

عہد حاضر کے اردو ناول کے منظر نامے کو دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ شاید ہی انسانی زندگی کا کوئی پہلو ہو کہ جو عہد حاضر کے ناول نگاروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا ہو، یہی وجہ ہے کہ آج نفسیات، عمرانیات ،سیاسیات کے ساتھ ساتھ جملہ علوم و فنون زندگی کی کارفرمائی کی وجہ سے اردو ناول کا دامن بہت وسیع اور موضوعات کے حوالے سے مالا مال نظر آتا ہے۔ لیکن تمام تر علوم و فنون اور ایجادات و اختراعات اور سائنس فکشن کے ساتھ ساتھ جو جذبہ بنیادی طور پر ادب کا محور ہے وہ جذبہ محبت کا بنیادی و انسانی جذبہ ہے۔ محبت کے اسی آفاقی و اساسی اور عالمگیر جذبے کے گرد علی سیاف نے اپنے ناول ''عالیہ'' کا تانا بانا بنا ہے ناول میں بنیادی ماجرا محبت کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ ناول کے عنوان کے حوالے سے ہوسکتا ہے کہ عہد ماضی میں بھی اس عنوان کا کوئی ناول موجود ہو لیکن جیسا کہ ادب کے سنجیدہ قارئین جانتے ہیں کہ ادیب بیک وقت دو دنیاؤں سے اکتساب کرتا ہے اور شعوری و لاشعوری طور پر معاشرے اور دنیا سے متاثر ہوتا ہے اس کے اندر ردو قبول کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو اس کے تلازمہ خیال کو تلازمہ لفظی میں بدلنے والا تخلیقی عمل ہے۔ اس طرح ہر ادیب کا اکتساب الگ ہوگا اور ہر تخلیق الگ تخلیق ہوگی۔ ہر مصنف اپنے تجربات زندگی یا اکتساب زیست کے مطابق ہی لکھتا ہے۔ علی سیاف کی تحریر مصنف کے لاشعوری اور شعوری اکتسابات کی پہلی جھلک ہے۔

2014ء میں شائع شدہ اس ناول بلکہ ناولٹ (ضخامت کے اعتبار سے) میں علی سیاف نے ایک خاندان کی دو نسلوں کی زندگی کی داستان کو ناول کی صورت دی ہے۔ اس خاندان کے کرداروں کے علاوہ ضمنی و معاون کرداروں کی ایک دنیا دکھائی دیتی ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ علی سیاف نے توازن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور پلاٹ کی واقعاتی تکمیل میں ضمنی کرداروں کو کہانی پر حاوی نہیں ہونے دیا جیسا کہ عام طور پر نئے لکھاریوں کے ساتھ معاملہ پیش آتا ہے۔ ٹریجک عناصر کو ادبی فن پاروں میں ایک قدر اور روایت کا درجہ حاصل ہے۔ ناول عالیہ میں ناول نگار نے مرکزی کرداروں کو بار بار قسمت کے ہاتھوں کھلونا بنتے دکھایا ہے جس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ناول عورت کی مظلومیت اور تقدیر کے بے رحم ہاتھوں کی داستان ہے۔ علی سیاف نے ٹریجک عناصر کو کہانی کے متوازی رکھ کر کہانی کا اختتام خوشی اور مسرت پر کیا ہے۔

منظر نگاری کے حوالے سے علی سیاف کی ژرف نگاہی قابل داد ہے کہ دیہاتی و مضافاتی زندگی کی تصویر کشی اس طرح کی ہے کہ تحریر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ملاحظہ ہوں منظر نگاری کے حوالے سے ناول کی یہ سطور:

''جولائی کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور موسم برسات بھی اپنے جادو جگانے کے لیے بے تاب تھا۔ آج صبح ہوتے ہی آسمان پر کالے سیاہ بادل چھا گئے۔ یکا یک موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی جان محل کی ہر چیز سے کھیلنے لگا۔ خاص طور پر لان میں سجے ہوئے پھول اور درخت اس طرح نکھر گئے کہ جیسے پہلے دن کے بچے کو غسل دینے سے وہ نکھر جاتا ہے۔'' (عالیہ:43)

اور: ''سارے جان محل کو ایک شان دلربائی کے ساتھ مزیّن کیا گیا تھا، جان محل میں گلوب اس طرح روشن تھے جیسے جگہ جگہ چاند آویزاں ہوں۔ پھولوں کی کیاریوں سے خوشبو اس طرح آرہی تھی جیسے دلہن کے لباس سے آتی ہے۔'' (عالیہ:55)

ناول کی ہیروئین کے نام پر علی سیاف نے اپنے پہلے ناول کا عنوان رکھا ہے۔ ناول کے کینوس پر عالیہ کے ساتھ زندگی جو سلوک کرتی ہے اس کو اجاگر کرنے کے لیے علی سیاف نے ایک مختصر پس منظر کے بعد عالیہ

کی پیدائش سے کہانی کا آغاز کیا ہے۔ جب شبو اور شاہ گل کے گھر میں عالیہ نام کی کلی کھلتی ہے تو اس موقع کی عکاسی علی سیاف نے یوں کی ہے:

''اگر بچی کے چہرے کو چاند سے تشبیہ دوں تو ایسا لگتا ہے کہ مجرم ہوں کیوں کہ عالیہ کے چہرے پر ذرہ برابر بھی تل کا نشان تک نہیں ہے اور اگر آفتاب سے تشبیہ دی جائے تو بے انصافی ہوگی کیوں کہ کوئی عالیہ کے چہرے کے کتنا ہی قریب ہو جائے، جلن کا احساس نہیں ہوتا۔ بس اتنا کہتی ہوں کہ عالیہ کا چہرہ بھی عالیہ ہے۔ ہماری بچی کی پرنور پیشانی پر طلائی حروف سے عالیہ لکھا ہے۔'' (عالیہ:14-13)

ناول میں عالیہ کا کردار ایک متحرک کردار ہے جو زندگی کی کشاکش میں ذاتی سوچ بھی رکھتی ہے لیکن جس معاشرے میں اس کی پرورش ہوئی ہے اس وجہ سے وہ معاشرتی قدروں کی پاسداری بھی کرتی ہے اور اسی پاسداری میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ وقت کی لہروں کے ساتھ بہہ رہی ہے۔ نسوانی کردار نگاری کے ضمن میں ''عالیہ'' رومانوی کردار کے طور پر یاد رہ جانے والا کردار ہے کیونکہ بنیادی طور پر ٹریجک کردار ہے۔ ایک ایسا نسوانی کردار کہ جس کی زندگی اس کی اپنی ماں کی طرح ہی گزرتی ہے۔ جس طرح عالیہ کی ماں شبو، شاہ گل کے ساتھ زیادہ عرصہ زندگی نہ گزار سکی اسی طرح عالیہ بھی عین اپنی شادی کے دن لباس عروسی میں بیوہ ہو جاتی ہے۔ علی سیاف نے تاثر ابھارنے کی کوشش کی ہے کہ زبیر کا کردار عالیہ کے شوہر کا قاتل ہے لیکن ناول کے کینوس پر اس کی کوئی معقول وجہ مصنف نے نہیں تراشی اس حوالے سے ناول میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے تایا زاد علی سے شادی اور بیوگی کے بعد عالیہ کی زندگی میں حسن رضا نامی کردار آتا ہے۔ حسن کے ساتھ اسے نکاح ثانی کی ترغیب بابا جان دیتے ہیں۔ اس موقع کی عکاسی مصنف نے یوں کی ہے:

''بیٹی! یہ زندگی ایک نخلستان کی سی ہے یا یوں کہو کہ ایک ریگستان کی سی ہے اس بے کنار صحرا میں اگر کبھی آسمان پر بدلی چھا جائے تو کفران نعمت نہیں کرنا چاہیے، نہ جانے پھر کب برسات ہو؟'' (عالیہ:72)

مشرقی اقدار کی پروردہ ہونے کے باوصف عالیہ انکار نہ کر سکی اور یوں جس گھر میں وہ بہو بنا کر لائی گئی تھی اسی گھر سے اسے بیٹی بنا کر رخصت کیا جاتا ہے لیکن یہ رخصتی بھی خوشیوں کا عارضی جہان نکلا کہ حسن رضا شادی کے بعد امریکہ سیٹل ہونے کے چکروں میں وہاں شادی کر لیتا ہے۔

شبو اور شاہ گل کے متوازی مصنف نے اکبر اور شیریں کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ اکبر کو چالاک لوگ مقدمے میں پھنسا دیتے ہیں اور اسے عمر قید ہو جاتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے مصنف نے عصر حاضر میں عدالتی و قانونی صورت حال کی طرف خفیف سا اشارہ کیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ''عالیہ'' ایک رومانوی ناول ہے جس کے پلاٹ میں ڈرامائی تکنیک کی کارفرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ ڈرامائیت کے عنصر کی وجہ سے واقعات بڑی تیزی سے بدلتے ہیں اور اسی عنصر کی بدولت ناول کے آخر میں ''شاہو'' کا کردار عالیہ کے باپ ''شاہ گل'' کے اصل روپ میں آ جاتا ہے جو اپنے باپ سے لڑ کر ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ گیا تھا اور شاہ گل سے شاہو بن گیا تھا وہ خودکشی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اس لیے شاہ گل باقی کی زندگی ''شاہو'' بن کر گزارتا ہے۔ علی سیاف کی اس پہلی تخلیق میں ایک خاص مسلک کے عقائد کا بھی بین السطور اظہار ہوتا ہے اس میں کوئی قباحت تو نہیں دنیا کے ہر ادب پر اس خطے کے مذہب کی چھاپ دکھائی دیتی ہے جس خطے میں وہ پروان چڑھتا ہے لیکن یہ بات بھی امر حقیقت ہے کہ ادبی لوگوں کو معاشرتی بندھنوں سے ماورا ہو کر اور بلند ہو کر لکھنا چاہیے تبھی فن پارے میں آفاقیت جھلکے گی۔ ناول کی کمپوزنگ میں پیراگراف کی سیٹنگ اور چند املائی غلطیوں کو نظر انداز کرنا چاہیے کہ ایسے کرشمے کمپوزر حضرات کی وجہ سے وقوع پزیر ہوتے ہیں اور مصنف کا ان میں دخل نہیں ہوتا۔ ناول ''عالیہ'' علی سیاف کا اولین ناول، بارش کا پہلا قطرہ اور کینوس پر نقش اول ہے۔ امید ہے کہ علی سیاف کا تخلیقی سفر جاری رہے گا اور وہ اسی طرح محبتوں کے صادق جذبوں کو قلم کے سپرد کرتے رہیں گے۔

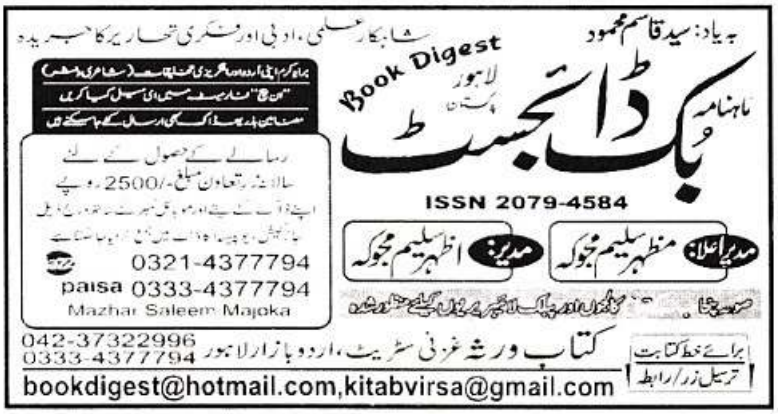

''مدحِ محمودؐ'' وفورِ شوق اور جذبۂ ایمانی کا آئینہ مصفّا

تصوّر اقبال

رسول اللہ کی ذاتِ والا صفات و بابرکات کی عظمت و فضیلت، علوئے منسبِ رسالت و بعثت، مقام و مرتبۂ نبوت، حیثیتِ ختم الرسل، وجۂ تخلیقِ کائنات، رفعت وشوکت اور صفتِ رحمتِ عالمین کے باعث ہر دور میں مسلم اور غیر مسلم شعرائے کرام نے آپ کے اعلیٰ اخلاق و کردار کو اپنے اپنے طور پر اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جس طرح حمد کا لفظ اللہ تعالیٰ کی ثناء کے لئے وقف ہے۔ بعینہٖ لفظِ نعت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعریف وتوصیف کے لئے مختص ہے۔ یوں تو ہر شاعر اور شاعرہ کی خواہش اور کوشش ہے کہ وہ حضور نبی کریمؐ کی شان میں اشعار لکھ کر اپنے ایمان کو تازہ اور مزید پختہ کرے لیکن یہ سعادت ہر کسی کے حصّے میں نہیں آتی۔ نعت اور آدابِ نعت باہم لازم و ملزوم ہیں نعت لکھنے کے لئے وجہ وجودِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے حد درجہ محبت وعقیدت اور عشق شرطِ اول ہے لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر عاشق ایک نعت گو شاعر کی حیثیت سے پہچانا جائے۔ نعت کا نزول حکمِ ایزدی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ دو چار مصرعے یا چند نعتیں کہنے سے کوئی بھی شاعر نعت نگار نہیں بن جاتا۔ محمد افتخار الحق ارقم صاحب جو پیشے کے اعتبار سے ایک کامیاب اور مستند ڈاکٹر ہیں اس لئے عظیم ہیں کہ انہیں نعت گوئی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ہر چند کہ ان کا حمدیہ کلام بھی کتابی شکل میں منظرِ عام پر آچکا ہے اور اہلِ نقد ونظر سے خُوب داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔ ''مدحِ محمودؐ'' ارقم صاحب کا اولین نعتیہ مجموعہ ہے جس کے بیک ٹائٹل پر مزید چار نعتیہ مجموعوں (تین اردو اور ایک پنجابی) جبکہ ایک مجموعہ حمد بعنوان ''نحمدُہٗ'' کا اشتہار دیکھ کر موصوف کی تخلیقی صلاحیتوں اور تنزیلِ حمد و نعت پر رشک آرہا ہے۔

ارقم صاحب اپنی اس خوش نصیبی، نیک بختی اور سعادت وفضیلت پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے کیونکہ جو متاعِ گراں بہا اور دولتِ رفتہ ان کے حصّے میں آئی ہے ہر شاعر کے نصیب میں نہیں۔ یقیناً عشق ومحبت اور عقیدت والفت کی یہ سرشاری اور بیداری اس کا مقدر ہے جس کے قلب ونظر اور جسم جاں نُورِ حرا کی ضیا سے منور اور مستیز ہوں۔ ''مدحِ محمودؐ'' وفورِ شوق، جذبہ ایمانی اور عقیدت وارادت کا ایک ایسا نادر و نایاب اور دل پذیر و دل شاد مجموعہ ہے جس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ جناب اکرم کنجاہی کہتے ہیں۔ ''مدحِ محمود کے خالق نے حضور سے دل کی بات شاعری کی زبان میں کی ہے نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ گردو پیش کا حال بیان کیا ہے۔ وہ امتِ مسلمہ کا بڑا گہرا درد رکھتے ہیں اور اُسے ذاتی تکالیف سے اہم خیال کرتے ہیں۔ زمانے کی بے رخی، گم گشتہ نشاۃِ ثانیہ، امت کے مسائل، زبوں حالی، عامۃ الناس کی بے حسی، دکھ درد، پسماندگی، خوف اور اضطراب کی بات کر کے حضور رحمتِ دو عالم کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ارقم کی نعت اس بات کی دلیل ہے کہ نعت صرف نبی پاک کی تعریف وتوصیف تک محدود نہیں اس میں طلب، تڑپ، شوق، پیغام، دعا سب کچھ ہے۔ انہوں نے نعت گوئی میں نئی لفظیات کو سلیقے سے برتا ہے اور اپنی نعت کو اسلوب بیاں میں معاصرین سے الگ رکھا ہے ان کے ہاں الفاظ اجنبی محسوس نہیں ہوئے کہ خوش فکر شاعر نے فنی مہارت و ادراکات سے عروضی تقاضوں کو پورا کیا ہے''۔

اس معتبر اور مستند رائے کا احترام کرتے ہوئے میں اپنی بات کو یوں آگے بڑھاتا ہوں۔ اس مجموعۂ نعت میں شامل سارے کا سارا کلام حُسنِ بیان اور قدرتِ زبان وبیان کا بے مثال اور اعلیٰ نمونہ ہے۔

صنفِ نعت کے وجودِ محمود ومسعود میں محبت و عقیدت اور حاضری وحضوری کے جملہ رنگ اپنے تمام تر خواص اور مٹھاس کے ساتھ موجود ہیں۔ نعت کہنے کے لئے جو شعری پیمانے مقرر کیے گئے ہیں اور جو تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں ان کے لئے مہارت، مقابلیت اور ہنرمندی بطورِ خاص درکار ہوتی ہے۔ ارقم صاحب کے کلام میں زندگی اپنی تابندگی کے ساتھ جلوہ فرما ہے اس جلوہ گری نے ان کے نعتیہ کلام پر عقیدت ومحبت کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں درحقیقت یہی وہ نقش ہیں جو سُخن کی آن بان اور شان کہلاتے ہیں چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

عظمتِ اسلام وابستہ ہے ان کی ذات سے
دین نبیؐ کی ذات ہے ایمان نبیؐ کی ذات ہے

واقعہ معراج کا پڑھیے تو کچھ لگتا ہے یوں
جیسے مکے سے خدا کا عرش اک دو گام ہے

وہ حاملِ صفات ہیں وہ حاصلِ حیات ہیں
دلوں میں وہ مقیم ہیں مرے نبیؐ عظیم ہیں

اُن کی چشم کیف زا بیدار ہو یا فی المنام
محوِ تسبیح خدا ہے ان کا قلبِ لاینام

صرف لب کو مت ہلا خونِ جگر بھی صرف کر
صرف لفظوں سے نہیں ممکن ثنائے مصطفیٰؐ
وہ محمد مصطفیٰؐ جو ہیں رسولوں کے امام
ہے تصور کی حدوں سے بھی بلند ان کا مقام
آئینۂ حیات کے اُوپر جما ہوا
برسوں سے تھا جو رنگ اتارا حضورؐ نے

نعت لکھنے بلکہ نعت کہنے کے لئے جہاں بہت سے امور کا خیال اور پاس رکھنا پڑتا ہے وہیں بہت سے اقدام کا سنبھالنا بھی ازبس ضروری سمجھا جاتا ہے شاید اس کا ادراک ارقم صاحب کو کہیں زیادہ ہے۔ میرا تصور اس ایک نکتے پر کھڑا ہے کہ ارقم صاحب وہ خوش قسمت اور خوش نصیب آدمی ہیں۔ جنہیں نعت گوئی کا فن آتا ہے بھلے انہیں ربِّ کائنات نے ودیعت کر دیا ہے۔ روایت اور جدت کا حسین امتزاج اس نعتیہ کلام میں جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ حضور نبی کریمؐ کی سیرت، صُورت، کردار، افکار واقعات اور مقامات کا ذکر خوبصورت اور دلنشیں پیرائے میں ملتا ہے۔ بقول شخصے ''نعت توفیق خداوندی ہے یہ ایک سرمدی نغمہ ہے جو ہر قسم کے تغیر و تبدل سے مبرا ہے اس میں عروج ہے زوال نہیں۔''

اس قول کے تناظر میں اگر ارقم صاحب کا نعتیہ کلام دیکھا جائے تو سچائی حرف بہ حرف ہم پر آشکار ہو رہی ہے۔ ایک مسیحا جس کا کام بیمار کی شفایابی یا مسیحائی کرنا ہے۔ وہ فارغ اوقات میں یا نزولِ نعت کے وقت اگر حضور پُرنُور شافع یوم النشور کی تعریف و توصیف بالکل منفرد اور اچھوتے انداز میں کرتا ہے تو اسے مقامِ عشق سے بھی آگے کا نام دیا جا سکتا ہے جسے ہم جنوں کہتے ہیں۔ ''مدحِ محمود'' میں شامل۔ بیشتر کلام انتہائی اعلیٰ مقام و مرتبے کا حامل ہے۔ جو یقیناً نعتیہ شاعری کی تاریخ میں زندہ جاوید رہے گا۔ عام فہم، سادہ، سلیس اور رواں مصرعوں کے ساتھ ساتھ مُشکل الفاظ کا استعمال ارقم صاحب کی نعتوں میں کثرت سے ملتا ہے لیکن اس مشکل پسندی کا توڑ الفاظ کے کے برمحل اور حسین استعمال نے از خود کر دیا ہے۔ عربی الفاظ کا چناؤ جس نزاکت، نفاست اور ہنرمندی سے کیا گیا ہے وہ اس بات کی قوی دلیل ہے کہ ارقم صاحب قرآنی تعلیمات کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہیں۔ چھوٹی بحر کی نعتوں میں ردیف و قافیہ بندش ہو یا بڑی بحروں میں احساسات و جذبات کا برملا اظہار ہر دو صورتوں میں کلام بے مثال و لاجواب ہے۔ تلمیحات اور تراکیب کا استعمال جس خُوبی، خوبصورتی، مہارت اور طہارت سے کیا گیا ہے وہ قابلِ رشک بھی ہے اور لائقِ صد تحسین و مبارکباد بھی۔ خیالات کی فراوانی اور نظریات کی ترجمانی کا انداز بھی دلنشیں اور اثر آگیں ہے۔ اسلوبِ بیان کہیں سادہ تو کہیں بے ارادہ، کہیں سلاست و روانی تو کہیں ترنم و نغمگی، کس کس خوبی کو احاطۂ تحریر میں لایا جائے۔ قصہ مختصر ''مدحِ محمود'' ایک سچے و سُچے مسلمان اور حضور اکرمؐ سے بے پناہ عقیدت و محبت کرنے والے شاعر کا ایک ایسا خوبصورت، دل پذیر، یادگار اور کیف آگیں اشعار پر مشتمل گلدستہ ہے جس کی مہک اور خوشبو اہلِ دل، اہلِ ایمان اور اہلِ فکر و نظر کے مشامِ جاں کو تادیر معطر اور منور کرتی رہے گی۔ آخر میں جناب نسیم سحر کے مضمون سے اقتباس اور ارقم صاحب کے نعتیہ اشعار جو بجا طور پر ان کا حوالہ اور نعتیہ شاعری کا ''دوشالہ'' ہیں۔ ''مجموعی طور پر ڈاکٹر افتخار الحق ارقم کی تقدیسی شاعری کا خلاصہ اور خاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس میں بحروں کے متنوع استعمال کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں عربی و فارسی الفاظ کا عمدہ اور برمحل استعمال اس انداز میں کیا گیا ہے کہ جہاں ایک طرف تو شعر کی ترسیل بھی ہو جائے جبکہ دوسری طرف اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں یہ الفاظ قبولیت پالیں۔''

نفس کو تابندگی دے رُوح کو روشن کرے
جگمگائے ظاہر و باطن ثنائے مصطفیٰؐ
بات اک حفظِ مراتب کے حوالے سے کہوں
ہر بلندی عجز پیغمبر کے زیرِ دام ہے
رہِ نوردِ عرشِ اعظم راکبِ پشتِ براق
ارتفاعِ آسمانِ ہفتمیں زیرِ رکاب
انبیاء میں سے کسی نے جو نہیں دیکھے کبھی
اُس نے دیکھے ہیں شبِ اسریٰ وہ جلوے بے حجاب
تا ابد پروردۂ رشد و ہدایت ان کا نام
تاقیامت بالکِ طغیاں نبیؐ کی ذات ہے
باعثِ اصلاحِ احوالِ بشر اُن کا پیام
ضامنِ عافیتِ انساں نبیؐ کی ذات ہے
دور رس باریک بیں معنی نگر جوہر شناس
آپ ہی ہیں واقفِ ہر کیف و کم شاہِ امم
عدل کرنے میں بڑے بے باک بے روبے دریغ
بے نیازِ حرص و خوفِ ہم و غم شاہِ امم
میں کروں مدحت سرائی غیر کی ان کے سوا
اس قدر ارقم میسر کب مجھے فرصت ہوئی
مجھے درگاہِ حضرت کی غلامی چاہیے ارقم
بھلا کب احتیاجِ جُبہ و دستار ہے مجھ کو
لقب رُوح الامیں کا جس فرشتے کو ملا رب سیوہ میرا ہم
نوا ہوتا ہے جب میں نعت کہتا ہوں

حمدیہ شاعری اور ریاض ندیم نیازی

واجد امیر/لاہور

حمد خالق اور مخلوق کے درمیان وہ تعلق قائم کرتی ہے جو ہوتا تو اللہ جل وجلالہٗ کی منشا ہی سے ہے مگر اس میں عبد کی بندگی کا ذاتی اظہار بھی ہوتا ہے اب اگر سوچیں تو جس نے تخلیق کیا، نسل در نسل صلب در صلب ورثے کی منتقلی کا اہتمام کیا، پھر ایک قطرے سے وجود بخشا، دھڑکنا سکھایا، مکمل بنایا، سجایا، سنوارا، مناسب نین نقش دیے، بولنا سکھایا، چلنے میں توازن پیدا کیا، نطق دیا، سمجھ دی، دماغ دیا، علم دیا، اور پھر دو راستے دکھائے دونوں راستوں کو سمجھنے سمجھانے والی فہم دی، مزید برآں راہ آسان کرنے کے لئے ہادی بھیجے وہی اپنی حمد کا سلیقہ بھی عطا کرتا ہے۔

اب اگر اُس ذات کو پہچاننے کی بات کریں تو یوں جانیے اُسے پہچاننا بھی کارِ محال تھا جسے اُسی نے سہل کیا، وہی! جس نے علم دیا، اُسی نے پھر علم کو زبان دی اسے حرف سے روشناس کیا نطق سے گفت گو ایجاد ہوئی، اظہار، کے پیرائے وضع ہوئے، تخیل کی اڑانیں کہاں سے کہاں لے گئیں تخیل کے بہت سے رنگ نمایاں ہوئے جن میں ہنر وفن کی مختلف اشکال وقوع پذیر ہوتی وہیں مگر سب سے کمال کی تخلیق شعر ہے۔ انسان خود شعر کہہ کے اس کے سحر میں مبتلا رہتا ہے بعض اوقات اسے خود بھی نہیں معلوم ہوتا اس سے یہ کیا سرزد ہو گیا اس کی محنت کیسے رنگ لائی ہے ابتدا میں اپنی پسند ناپسند، پہ اظہار کرتا ہے، رویے پہ رائے دیتا ہے، کسی کسی کو یہ توفیق ملتی ہے کہ وہ اپنے اور اپنے خالق کے متعلق بات کرے، لہجہ تخلیق کار کی پسند کا ہوتا ہے لفظ جس قدر دست یاب ہوتے ہیں سوچ جہاں تک جاسکتی ہے لے جائی جاتی ہے مگر ہر بار اسے اپنی تخلیق اور اوّلیں تخلیق کار کی مدح میں حد درجہ کمی محسوس ہوتی ہے وہ لکھتا رہتا ہے ممدوح اسے دیکھتا رہتا ہے اور اس کی تخلیقی اُپج پہ تھپکی دیتا رہا ہے سخن ور کبھی شاداں کبھی مضمحل ہوتا ہے لیکن اپنا قرض ادا کرتا رہتا ہے۔ فرض ادا کرتا رہتا ہے کہ اس کی پرواز یہیں تک ہے۔

یہ ساری تمہید برادرم ریاض ندیم نیازی کے مجموعۂ حمد کے متعلق کی گئی ہے۔ ریاض ندیم نیازی کا تعلق سمّی سے ہے جو بلوچستان میں ہے سبی کو لوگ اس کے گرم موسم کے حوالے سے پہچانتے ہیں یا یہاں کے بیل معروف ہیں مگر ہمارے لیے اس علاقے سے اگر کوئی تعلق ہے تو وہ ریاض ندیم نیازی کی وجہ سے ہے۔

سبی کے ریاض ندیم نیازی ایم اے صحافت کے بعد ایک ادارے میں سرکاری نوکری کر رہے ہیں وہ تمام پاکستان میں شاید مشاعرے پڑھنے والے واحد شاعر ہیں، جنہوں نے پورے پاکستان میں مشاعرے پڑھے ہیں اور سارا سال وہ نہایت ذوق وشوق سے ان محافل میں شرکت کرتے ہیں صرف یہی نہیں وہ طرحی، ردیفی، نعتیہ، حمدیہ اور سلام و مناقب کے مشاعروں میں تواتر سے شرکت کرتے ہیں انہیں نہ تو سرکاری نوکری اس سے روک سکی نہ گھریلو مصروفیات ان کے آڑے آئیں ان تقریبات میں شرکت اور سفر درسفر کے باوجود انہیں کبھی تھکا نہیں دیکھا کہ وہ اس کام کو مشن کے طور پر اپنائے ہیں، نہ انہیں کبھی اپنے اخراجات کے متعلق کس قسم کا سوال کرتے دیکھا نہ ان کی آنکھوں میں نام ونمود کی ہوس نمایاں دیکھی۔ یہ تمام معاملات بلاشبہ حیران کن اور قابلِ تقلید ہیں، ہم پہلے کہہ چکے ہیں ملک عزیز میں ان جیسی اور کوئی مثال ہے ہی نہیں۔

ریاض ندیم نیازی حمد، نعت، غزل، سلام، منقبت، نظم اور ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کر چکے وہیں ان کا زیادہ تر کام مذہبی شاعری کے حوالے سے جانا جاتا ہے وہ پورے پاکستان میں ردیف، اور طرحی مصرعوں پہ ہونے والے سالانہ اور ماہانہ مشاعروں کا حصّہ بنتے ہیں۔ ان مشاعروں میں حمدیہ مشاعروں کی بھی کثیر تعداد دیکھنے میں آئی ہے جن میں ریاض ندیم نیازی شرکت کرتے ہیں اب اگر ریاض ندیم نیازی کی حمدیہ شاعری کی طرف آئیں۔ تو ریاض ندیم نیازی کی حمدیہ شاعری روایتی ہوتے ہوئے بھی جدت کا رنگ لیے ہے۔

جو سچ کہیں تو اس کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ حمد ایک مشکل صنفِ سخن ہے جس کی طرف لوگ کم کم ہی آتے ہیں بلکہ وہی آتے ہیں جن کے حوصلے سوا ہیں۔ ابتدیئے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کو اگر آگے بڑھائیں تو ہمارے پاس نہ مناسب لفظ ہیں، نہ بندشیں ہیں، نہ اس کے لئے کوئی استعاراتی نظام وضع کیا جاسکتا ہے نہ کس سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے لے دے کے اس کی بنائی ہوئی دنیا کی تعریف کی جاسکتی ہے اور مناجات کی جاسکتی ہے اپنے لئے رحم و کرم کی گزارش کی جاسکتی ہے۔ یہی سلیقہ اور قرینہ اس صنف کی کچھ ساکھ بنا سکتا ہے۔

ابتدائی سطور میں جس طرح اشارہ کیا گیا وہ انسانی علم وقلم کی عجز بیانی ہی ہے کہ رب العلیٰ کی تعریف کیا ہو اور وہ بھی انسان سے؟ بے شک ممکن نہیں مگر یہ بھی

اُس نے سکھایا کہ کیسے اُس کی حمد وثناء کی جائے۔

چوں کہ ریاض ندیم نیازی تواتر سے مذہبی شاعری کر رہے ہیں ظاہر ہے مشاعروں میں شرکت اور شائع ہونے والے انتخابات بھی ان کی نظر سے گزرتے ہیں سو وہ مروجہ منظر نامے کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں غالب امکان یہی ہے حمدیہ فضا میں سانس لینے سے یہ مشکل فن اور طرزِ اظہار ریاض ندیم نیازی پہ رمز کشا ہوا ہے اور یہ کہ ان کی حمد نئے تلازمے بنانے نئی لفظیات کی بندشیں بنانے سے مشتق ہے ریاض ندیم نیازی کے سامنے بہت سا کام ہوا پڑا ہے، انہیں اس میں سے اپنے لئے راستہ نکال کے اپنی شناخت بنانی ہے اور بہت حد تک ریاض ندیم نیازی نے اپنے لئے ایک مشکل راستہ انتخاب کیا ہے جس میں وہ بار بار ایک ہی طرح کے موضوعات پہ مختلف طرحی مصرعوں، بحور، انوکھی ردیفوں، اور مختلف النوع قافیوں سے الگ الگ موضوعات پہ سخن آرائی کرتے ہیں اس پہ مقدس قابلِ احترام شخصیات کی توصیف میں احتیاط کا دامن بھی تھامے رکھتے ہیں ان کی حمدیہ شاعری فہم و ادراک پہ ثقیل نہیں، آسان، رواں یہ حمدیہ شاعری مشکل اور ادق مضامین سے پہلو تہی کرتی دکھائی دیتی ہے یہی حمدیہ شاعری نو واردانِ سخن کو سہولت سے حمد کہنے کی طرف آمادہ کر سکتی ہے۔

ریاض ندیم نیازی ملک کے طول وعرض میں نعتیہ مشاعروں، حمدیہ مشاعروں، نعتیہ کانفرنسوں میں بلائے جاتے ہیں اور ذوق وشوق سے شرکت کرتے ہیں بعض اوقات ان کی اس درجہ وابستگی پہ رشک بھی آتا ہے اور حیرت بھی ہوتی ہے وہ لمبے سفر پہ بھی بغیر کسی دشواری کے نکل پڑتے ہیں مذہبی شاعری کرنے والے شعرا اور وطنِ عزیز کے طول وعرض میں واقع مختلف ادارے اور تنظیمیں ان کے دل کے بہت قریب ہیں یہ تنظیمیں بھی انہیں فراموش نہیں کرتیں شاذ ہی کوئی حمد، نعت، سلام ومناقب کا مشاعرہ یا انتخاب ہو جس میں انہیں شامل نہ کیا گیا ہو۔ ان کے حمدیہ کلام سے کچھ اشعار دیکھیے.....

مجھے ہر طرف نظر آئے تو، تری شان جلّ جلالہٗ
تری قدرتیں مرے چار سو، تری شان جلّ جلالہٗ
مرے انگ انگ میں تو بسے، ترا رنگ اور تری بو بسے
رکھے گرمِ شوق، مجھے لہو، تری شان جلّ جلالہٗ
مری قبلہ گاہ، حرم ترا، میں اُمیدوارِ کرم ترا
ترے نام مری آبرو، تری شان جلّ جلالہٗ

.....

ہم تری رحمت سے زیرِ آسماں پھولے پھلے
جس طرف بھی ہم نکل آئے وہاں پھولے پھلے
کرم سے اپنے مجھے کوئی چشمِ تر بھی دے
دُعا کو لفظ دیے ہیں تو پھر اثر بھی دے
مرے بیان کو تابانیِ سحر بھی دے
جو تیری حمد کے لائق ہو وہ ہُنر بھی دے

نعت

جو پوچھا، دردِ جاں لیوا کا کیا اکسیر ہے دارُو؟
کہا، جبریل نے ''دیار محبُوبِ خداؐ کا ہے''
جو پوچھا، جان و دل سے بڑھ کے پیارے نام کی بابت
کہا، اک نام پائیدار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، اہلِ دانش سے حقیقت میں کا ہے دل؟
کہا کہ مخزنِ انوار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا کہ خدا کے بعد عظمت، برتری کس کی؟
کہا، یہ مرتبہ معیار محبُوبؐ خدا کا ہے
جو پوچھا، اپنے ہاتھوں سے کیا خالق نے کیا تخلیق؟
کہا کہ خوب تر شاہکار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، کس جگہ حاضر ملائک رہتے ہیں دن رات؟
کہا، وہ کوچہ و بازار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، داماں کس در سے بھولے جاتے ہیں مقصد کے؟
کہا، عالی سا اک دربار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، کون ہے طیبہ کی گلیوں میں یہ سرگرداں؟
کہا ''بندہ پریشاں وار'' محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، حرمتِ سرکارؐ پہ مر مٹنے والے کا
کہا، شیدا دیوانہ وار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، کمتریں بندہ کیوں چوکھٹ پہ رہتا ہے؟
کہا، احقر سا خدمت گار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، عالمِ کون و مکاں کا کون ہے مختار؟
کہا، سب کچھ شہِ ابرار، محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، کب ہوا آغاز درودِ پاک، مدحت کا؟
کہا، ماہتاب سا رُخسار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، کتنا ہے کیسے مدینے کا سفر ہر بار؟
کہا، لطف و کرم ہر بار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، خلق کا، کردار کا سیرت نگاروں سے
کہا، خوش خلقی و کردار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، چودھویں کے چاند سے، تیرا یہ ناز وحسن!
کہا، صدقہ مرے سرکار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، قامتِ سرکار کی بابت تو آنکھوں نے
کہا، قد قامتِ جیدار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، سیّد شبیرؑ کی بابت تو منوانے
کہا، اک لاڈلا اسوار محبُوبِ خداؐ کا ہے
جو پوچھا، کون ہے نغمہ سرا شب بھر سے اے زائر
کہا، اک شاعر ناچار محبُوبِ خداؐ کا ہے

عبدالقیوم زائر/امریکا

راجا غلام اصغر طاہر کے قلم کی روانی

کرامت بخاری/ لاہور

اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے والا کوئی بھی مورخ جوہر نظامی کے خانوادے کے ادبی مقام، اُن کے نام، کام اور مقام کا اعتراف کیے بغیر اپنی تاریخ مکمل نہیں کر سکتا۔ جوہر آباد جسے پاکستان کا دارالحکومت ہونا تھا اور بوجہ ایسا نہ ہو سکا لیکن ادب کا دبستان کہلانے کا مستحق ہے۔ جناب حسن اختر جلیلؔ سے میری ملاقات اُس وقت ہوئی جب وہ میرے ضلع میں ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر تھے۔ انھوں نے اپنا مجموعہ کلام مجھے دیا اور بہت ساری باتیں ہوئیں۔

راجا نادر علی میرا Batch Mate تھا۔ اُن کے والد اور میرے چچا اقبال حسین شاہ نے TDA میں اکٹھے کام کیا۔ یہ وہ دن تھے جب شکیب جلالی، نصرت چودھری، منشا پانی پتی، جوہر نظامی جیسے اہم ادیب اور دانشور فضائے ادب کو مہکائے ہوئے تھے۔ آج راجا غلام اصغر طاہرؔ نے اُن کے فن اور شخصیت کے حوالے سے کتاب مرتب کی ہے۔ تو یادوں کے دریچے کھل گئے۔ مَیں بھی اب کارگاہِ سخن کی بافت ہنستے ڈھلتی عمر کی منازل پر آ پہنچا ہوں۔

اس خانوادہ کو خالق نطق ولب نے مودتِ محمد و آل محمد علیہم السلام کی نعمت سے نوازا ہے۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر تحریر ثنائے چہاردہ معصومین علیہم السلام کی خوشبو سے معطر ہوتی ہے۔ باب العلم سے جڑے ہوئے لوگ ہی علم و آگہی کے سفیر ہوا کرتے ہیں۔ حسن اختر جلیلؔ کی شادی میں جگہ جگہ اس روشنی کو روشنائی کا ہم سفر دیکھا جا سکتا ہے۔ یقیناً راجا غلام اصغر طاہرؔ نے اپنے اشہب کلکِ سخن کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ اُن کا انداز تحریر اسلوب بیان اپنی ادبی وراثت کا امین ہے۔ ایسے نابغہ روزگار روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ جانے اس پسماندہ خطہ کو اتنے زرخیز دماغ کیسے ودیعت ہوئے۔ یہ بھی ایک رازِ قدرت ہے۔ تنقید، تحقیق اور تجزیہ کا عمل بھی اتنا ہی تخلیقی عمل ہے جتنا کہ تخلیق بذاتِ خود ہے۔

راجا غلام اصغر طاہرؔ کے دلائل، حوالہ جات، مباحث، موضوعات تفہیم، ابلاغ اُن کی ادب، فن، علم اور آگہی سے آگاہی کا غماز ہے۔ راجا صفدر صاحب ہوں یا راجا مظفر حسن منصورؔ یا راجا فرخ حسن اِن شخصیات نے بھی عمر بھر شعر و سخن کی آبیاری کی۔ زبان و بیان کے جوہر دکھائے۔ اگر جوہر آباد اور جوہر نظامی میں لفظ جوہر کو ایک استعارہ کیا جائے تو بات زیادہ واضح ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

راجا غلام اصغر طاہرؔ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس تحقیقی اور تخلیقی کام کو مرتب و تہذیب کیا۔ محبت سے اہل علم اور اہل قلم کی رائے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ کا باعث ہے۔ راجا صاحب لائق تعریف و توصیف قرار پائیں گے کہ انھوں نے دبستان سرگودھا اور دبستان جوہر آباد کے نامور سپوت تخلیق کار، اعلیٰ افسر اور دانشور جناب حسن اختر جلیلؔ کی ادبی خدمات کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا اور نژادِ نو کو نویدِ نو سے نوازا۔ مجھے از حد خوشی ہوئی کہ انگہ، ہرنولی اور جوہر آباد جیسے بے آب و گیاہ ہلق و دق صحرا اور پسماندہ علاقوں کے اب بڑے لوگوں پر لکھا جا رہا ہے۔ مَیں دعا گو ہوں کہ راجا غلام اصغر طاہرؔ کے قدم اور قلم میں روانی اور فکر و آگہی میں جوانی کا دور دورہ رہے۔ اور ان کا یہ کام اُردو ادب کے گلستان میں تازہ پھول کی طرح مہکے۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔

عامر بن علی/ جاپان

شبِ انتظار

سردیوں کی راتوں میں
جب سے بھی جم جائے
اور دل کی باتوں میں
آرزو ٹھہر جائے
اجنبی مسافر کے
انتظار کی شمعیں
سرد سرد جھونکوں سے
پھڑ پھڑانے لگ جائیں
اپنے سرد شانوں پر
رکھ کے سر کو مت رونا
تم اُداس مت ہونا

خزاں کی سانسیں اُکھڑ رہی ہیں

وہ زرد پتے اُڑانے والی
ہوائیں اب سرد ہو رہی ہیں
ہر ایک شب کی
ٹھٹھرتی دھڑکن یہ کہہ رہی ہے
خزاں کی سانسیں اُکھڑ رہی ہیں
تمہیں مبارک ہو اہلِ گلشن
ملن کے غنچے کھلانے والی
بہار آنے کو ہے وہ دیکھو
خزاں کی سانسیں اُکھڑ رہی ہیں

دشتِ دروں

وحید ناز/ لاہور

میں نے اُس سے پوچھا تم کون ہو تو کہنے لگی مجھے آزاد فضا میں تھوڑا سانس تو لینے دو مجھے اپنے حواس تو ٹھیک درست کر لینے دو۔ میں دو ن سے اس خاکی چولے میں قید تھی۔ آپ نے مجھے اس زندان سے رہائی دلوائی ہے اور نجانے کتنا سفر کر کے اور کیسی کیسی مشکلات اور صعوبتیں برداشت کر کے آپ تک پہنچی ہوں اور آپ ہیں کہ مجھے سامنے پا کے سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی ہے۔

میں نے اس کی جانب غور سے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ گھبرائی سی، سہمی سی اپنے آپ میں سمٹی ہوئی وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی اپنے معصوم سے چہرے کے ساتھ شرم و حیا کا پیکر نظر آ رہی تھی۔ اس نے پیلا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا جس نے اس کے نرم و نازک جسم کو بڑے باوقار طریقے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اُس کے لباس کے ایک کونے پر بنی کینڈل لائٹ اور کینڈل لائٹ کے شعلے سے نکلتی ہوئی روشنی اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہی تھی۔

میری نظریں اس کے سادہ اور معصوم سے چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور وہ آنکھیں بند کئے لمبے لمبے سانس بھر کے آزادی کی نعمت کو محسوس کر کے سرشاری ہو رہی تھی۔

اُس نے یک دم آنکھیں کھولیں اور شرماتے ہوئے دھیرے سے بولی مجھے فرحانہ عنبر صاحبہ نے اپنے ہاتھوں سے بناؤ سنگھار کر کے خاص طور پر آپ کے لئے بھیجا ہے۔ آپ میرے گداز جسم پر لکھی اک اک تحریر سے اپنے ذوق مطالعہ کی پیاس بجھا سکتے ہیں اب میں آپ کی دسترس میں ہوں مجھے حرف حرف پڑھ سکتے ہیں۔ گنگنا سکتے ہیں۔

میرا نام تو دشت دروں ہے میرے نام کے معنی ہیں جنگل، ویرانہ، صحرا، لیکن میرے اندر بسیرا کئے ہوئے آسمان ادب کے روشن تارے زندگی کے تمام تر رعنائیوں سے واقف ہیں۔ میرے نام کی طرح ان کی سوچ اور خیال میں ویرانہ نہیں ہے۔ وہ زندگی جینے کا ڈھنگ جانتے ہیں اور زندگی کو انجوائے کرتے ہیں وہ زمانے کے دکھ سکھ اور معاشرے کی بے راہ روی کو شعروں میں ڈھال کر ان کا تدارک کرتے ہیں۔

میں نے اُسے اپنے کھردرے ہاتھوں میں لیا اور بڑے پیار سے دشت دروں کو کھولا تو پہلے صفحے پر لکھی تحریر نے چند لمحوں کے لئے مجھے روک لیا جس پر لکھا تھا۔

محترم جناب وحید ناز کے لئے بڑے خلوص کے ساتھ ان کے ذوقِ مطالعہ کی نظر..... (فرحانہ عنبر)

میں دل ہی دل میں فرحانہ صاحبہ کا شکریہ ادا کرنے لگا اور ایک سرشاری سی طبیعت میں محسوس کرنے لگا اگلے صفحے پر دشت دروں کا خوبصورت ٹائٹل بنا ہوا تھا۔ دشت دروں کی کمپوزنگ، امین اور ٹائٹل فہد امین کا بنا ہوا ہے اور اسے مرتب کیا ہے جناب محمد امین جان نے جن کا تعلق گوجرانوالہ سے ہے یہ کتاب دس شاعروں کی دس دس غزلوں پر خوبصورت گلدستہ ہے جس کے ہر پھول کی خوشبو ایک دوسرے سے جُدا ہے اس کتاب میں شامل تمام شاعروں کا تعلق بھی گوجرانوالہ سے ہے۔ محمد امین جان نے جونیئر اور سینئر شاعروں کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ دشت دروں میں شامل شاعروں کے نام کچھ اس طرح ہیں۔

اکرم افلاک، عرفانہ امر، محمد علی بشر، آصف ہاشمی، محمد امین جان، راحت ثمر، اجمل ہاشمی، عمران تنہا، محی الدین اور فرحانہ عنبر صاحبہ۔

یوں تو دشت دروں میں شامل ہر شاعر کا کلام دل کو چھو لینے والا ہے اور ہر شاعر پر ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے لیکن یہاں میں خاص طور پر فرحانہ عنبر صاحبہ کی بات کرنا چاہوں گا جو کہ ایک خوبصورت لب و لہجے کی شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے اچھے ترنم کی بھی مالک ہیں اللہ پاک نے انہیں سریلے گلے سے بھی نوازا ہوا ہے۔

شاعری جذبات اور احساسات کو بیان کرنے کا بہترین ذریعہ ہے ہر مرد و زن کے اندر اللہ رب العزت کی طرف سے کوئی نہ کوئی صلاحیت موجود ہوتی ہے جسے وہ بروئے کار لا کے معاشرے میں ایک نام اور مقام پیدا کرتا ہے۔

غزل اصنافِ ادب میں ایک ایسی صنف ہے جس پر ہر دور میں طبع آزمائی ہوتی رہی ہے اُردو ادب میں نثر نظم اور غزل کو یکساں مقام حاصل ہے اور ہر دور میں شاعرات نے ان تینوں اصناف میں لکھ کے مردوں کے شانہ بشانہ اردو ادب میں حصہ ڈالا ہے اور اس کی خدمت کی ہے اور میں سمجھتا ہوں جتنا کُھل کے عورت نے معاشرے میں پھیلے ہوئے ہر طرح کے ناسور پر لکھا ہے آج تک کسی مرد نے نہیں لکھا عورت

نے معاشرے کے رسم ورواج پر شعروں کے ذریعے بڑی گہری چوٹیں لگائی ہیں۔

اسی ایک قبیلے کی اُبھرتی ہوئی شاعرہ فرحانہ عنبر بھی ہیں۔فرحانہ عنبر کی دس غزلیں اس جان کی مرتب کردہ کتاب دشت دروں میں شامل ہیں اور امید ہے کہ بہت جلد ان کا نظموں اور غزلوں پر مشتمل مجموعہ کلام ہمیں پڑھنے کو ملے گا۔ان کا کلام تواتر سے ادبی رسالوں اور اخبارات کی زینت بنتا رہتا ہے اس کے علاوہ ٹی وی ریڈیو پر مورننگ شو میں اپنی شاعری اور آواز کا جادو جگا چکی ہیں۔

فرحانہ عنبر غزل اور نظم دونوں اصناف میں بڑی مہارت سے لکھتی ہیں لیکن اس انتخاب میں ان کی صرف غزلیات شامل ہیں ان کی شاعری میں وہ تمام خصوصیات اور موضوعات موجود ہیں جو پڑھنے والے کے ذوقِ مطالعہ پر پورے اُترتے ہیں۔

فرحانہ عنبر کی شاعری پڑھنے والے کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے ان کی شاعری میں ایک نویکلا پن محسوس ہوتا ہے۔انہوں نے ردیف اور قافیے کو بڑی اچھی طرح استعمال کیا ہے ان کی غزلوں میں سلاست ہے۔انہوں نے چھوٹی بحر کو بڑے احسن طریقے سے نبھایا ہے ان کے خیال میں بڑی وسعت ہے اور شاعری میں خیال کا بلند ہونا ہی اچھی شاعری کی علامت ہے۔

دشتِ جنوں میں راستے کھلتے چلے گئے
جب ہم چلے تو کارواں بنتے چلے گئے
تھاما جو تو نے ہاتھ رہ خار دار میں
لاکھوں گلاب راہ میں کھلتے چلے گئے

وہ میرے سامنے سے گزرا ہے
ضبط کس مرحلے سے گزرا ہے
حُسنِ روزِ ازل سے ہی عنبر
عشق کے زاویے سے گزرا ہے

.....

فکر انجامِ محبت کی تجھے کیا عنبر
تیری خاطر ہیں بہت ہاتھ اُٹھانے والے

.....

خودی کے آسماں پر جھلملاتے روشنی بن کر
افق کے پار وہ روشن ستارہ ڈھونڈتے رہنا

.....

اک جبر مسلسل کی سزا کاٹ رہے ہیں
انسان ہی انسان کا گلہ کاٹ رہے ہیں

.....

چاند جب جب نظر نہیں آتا
ہم مچلتے ہیں صبح ہونے تک
کٹ ہی جائے گا وحشوں کا سفر
آؤ چلتے ہیں صبح ہونے تک

فرحانہ عنبر نے محبت جیسے لطیف جذبوں کی بات بڑے ماہرانہ انداز میں کی ہے ایسے لگتا ہے کہ محبت سے ان کی آشنائی بڑی پُرانی اور پختہ ہے۔انسان انسان پر جو ظلم کر رہا ہے انہیں اس بات کا بھی بڑا دکھ ہے۔وہ معاشرے میں محبت، امن، بھائی چارہ کی فضا کو پروان چڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں۔

وہ اپنے اردگرد کے ماحول کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کرتی ہیں اور پھر اُسے شعروں کی مالا میں پرو کر قاری کے گلے کا ہار بنا دیتی ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں ہجر وصال، وفا، بے وفائی، محبت نفرت، بہار خزاں غرض کے زندگی کے ہر پہلو پر بڑی اچھی شاعری کی ہے۔ویسے بھی شاعر کبھی جھوٹ نہیں بولتا وہ جو لکھتا ہے وہ اُس کی اپنی ذات کا سچ ہوتا ہے یا زمانے کا سچ، فرحانہ عنبر کی شاعری بھی اسی لئے دلوں میں اُترتی ہے اس میں سچائی ہے۔جھوٹ اور بناوٹ نہیں وہ بات کو گھما پھرا کے کرنے کی عادی نہیں۔یہی وجہ ہے اُس کی سادگی کی جھلک اس کے شعروں میں بھی نظر آتی ہے اس سادگی کی وجہ سے جہاں انہوں نے ادبی حلقوں میں جہاں دوست بنائے ہیں وہاں ان کے مخالفین کی بھی ایک لسٹ نظر آتی ہے۔

فرحانہ عنبر نے برصغیر پاک و ہند کی روایت کو بھی زندہ رکھا ہوا وہ اکثر مشاعروں میں ترنم کے ساتھ اپنا کلام پیش کرتی ہیں۔جو سُننے والوں پر سحر طاری کر دیتا ہے۔

فرحانہ صاحبہ نے اتنے کم عرصے میں شہرت کے اُس مقام کو چھو لیا ہے جہاں پہنچنے کے لئے عمر کا ایک حصہ اور ریاضت درکار ہوتی ہے۔اپنے اچھے کلام اور خوبصورت آواز کی بدولت وہ دنوں میں لوگوں کے دلوں پر راج کرنے لگ گئی ہیں۔

اگر وہ اسی طرح مشقِ سخن جاری رکھیں گی۔تو وہ دن دور نہیں جب ان کا نام ادبی دنیا کے بڑے ناموں میں شامل ہوگا اور گوجرانوالہ سے نکل کر پورے پاکستان میں ان کی شناخت ہوگی۔اللہ پاک انہیں ان کی محنت کا ثمر عطا فرمائے آمین!

شاعری

ٹھانچے کسی نے ملامت کے مارے
کوئی چپ رہا ہے مروّت کے مارے
نحوست کی باتیں نہ کیجے یہاں پر
ہمیں کہہ رہے ہیں نحوست کے مارے
محلوں میں، گلیوں میں تھے شر کے شعلے
گھروں میں رہے سب شرافت کے مارے
جیے بھی تو بس نام ہی کا جیے ہیں
مسلسل مرے ہیں، بغاوت کے مارے
ابھی تک ہیں بے دست و پا زندگی میں
تمھاری بخیلی سخاوت کے مارے
عجب آگ تھی ہجر کی بستیوں میں
سلگتے رہے ہیں محبت کے مارے
کہاں پا سکیں گے وہ کوئی سہارا
کہاں جائیں راشدؔ مصیبت کے مارے

ممتاز راشدؔ لاہوری/لاہور

اسے ضرور میسر خراج آگ سے ہے
مجھے یقین ہے سارا سماج آگ سے ہے
بتا رہی ہے لگی آگ شہر شہر مجھے
کہ بادشاہ سلامت کا تاج آگ سے ہے
ڈرا رہے ہو بڑا آتشِ جہنّم سے
تمہارے دین کی لگتا ہے لاج آگ سے ہے
سلگ رہا ہے بڑی دیر سے بدن اس کا
ضرور وہ کوئی آتش مزاج آگ سے ہے
ترے مریض کا آدھا علاج ہے ترا وصل
ترے مریض کا آدھا علاج آگ سے ہے
ابھی تو اور بہت فائدے اُٹھانے ہیں
ابھی تو اور بڑا کام کاج آگ سے ہے
میانِ رسم ہے ناصر علی لگی ہوئی آگ
ضرور سالگرہ کا رواج آگ سے ہے

ناصر علی/لاہور

گلزار سا مزہ ہے دسمبر کی آگ میں
مکھن ملا رہا ہوں میں سرسوں کے ساگ میں
پانی کے ٹھاٹھیں مارتے دریا کی خیر ہو
تھوڑا بہت تو دودھ ملانا تھا جھاگ میں
سستا رہے ہیں عالمِ برزخ میں بیٹھ کر
ساری عمر گزار کے ہم دوڑ بھاگ میں
یہ زہر ہے جو آپ کے اندر بھرا ہوا
اک بوند دستیاب کہاں ہے وہ ناگ میں
کانوں میں زہر گھولتی سمع خراشیاں
بے وقت کوئی راگ ملایا ہے راگ میں
پڑتے ہیں ماند جب یہ جوانی کے ولولے
مسعود بیٹھتا ہے سمندر کی جھاگ میں
جس کو بلا رہے تھے بجھانے کے واسطے
اس نے بھی آ کے آگ لگائی ہے آگ میں

مسعود احمد/اوکاڑہ

یہاں دور تک جو سراب ہیں ذرا دیکھ لے
پڑے ہر طرف جو نقاب ہیں ذرا دیکھ لے
جہاں فصلِ گل کا نقاب اوڑھا خزاؤں نے
وہاں درد ہی کے گلاب ہیں ذرا دیکھ لے
وہ جو رتجگوں کے اندھیر میں کہیں کھو گئے
مرے اُجڑے اُجڑے وہ خواب ہیں ذرا دیکھ لے
ترے عہد جبر میں لٹ گئے ہیں جو آشیاں
یہاں کتنے خانہ خراب ہیں ذرا دیکھ لے
انہیں ڈھونڈ لے جو تری صفوں میں غنیم ہیں
وہ جو چہرے زیرِ نقاب ہیں ذرا دیکھ لے
تو سمجھتا ہے جسے منفعت ذرا غور کر
وہ خساروں ہی کے حساب ہیں ذرا دیکھ لے
مجھے لاجواب کرے گا کیا تو جلیلؔ اب
مرے پاس سارے جواب ہیں ذرا دیکھ لے

احمد جلیل/اوکاڑہ

چشمِ نم نے سیم بنانا چھوڑ دیا ہے
ہم نے اب دیوار کا شانہ چھوڑ دیا ہے
سب کچھ پہلے جیسا ہے پر اس سے کہنا
اک پنچھی نے گیت سنانا چھوڑ دیا ہے
اتنی گھاس کہاں اُگتی تھی پگڈنڈی پر
یارو تم نے آنا جانا چھوڑ دیا ہے
اس کیفے میں آج بھی کافی مل جاتی ہے
بس لوگوں نے شام منانا چھوڑ دیا ہے
اک دوجے کو ڈھونڈ کے کتنا خوش ہوتے تھے
بچپن کا وہ کھیل پرانا چھوڑ دیا ہے
اب کمرے کی تصویریں بھی چپ رہتی ہیں
دیواروں نے حال بتانا چھوڑ دیا ہے
تجھ سے جیت کے دل کا مہرا پٹ جانا تھا
تیری خاطر مات کا خانہ چھوڑ دیا ہے

دل سے لپٹی بیل پرانی دیکھ رہے ہو؟
مت دستک دو کام کہا نا، چھوڑ دیا ہے

عاطف جاوید عاطف/لاہور

زندگی ہے تو ، مصیبت ہی سہی
اس عنایت کی یہ اُجرت ہی سہی
نہ ملے اذنِ ملاقات ہمیں
در پہ دستک کی اجازت ہی سہی
تیرے ہونے کی صداقت کے لیے
میرا مٹنا بھی ضرورت ہی سہی
سر جھکانا ہی مشیت کے حضور
ہے عبادت تو عبادت ہی سہی
صرف جینا ہے چلے جانا ہے
ایسی فرصت سے فراغت ہی سہی
سب کو دیدار ادھر وعدۂ دید
ہم فقیروں کو قناعت ہی سہی
سب کو دیتا ہوں دعائیں جاؤ
مفلسی میں یہ سخاوت ہی سہی

جانِ عالم/مانسہرہ

اہلِ جنوں کو بھی تو جنوں کا خراج ہو
اے زندگی حساب ذرا یہ بھی آج ہو
چاہے گا اور کیا بھلا کوئی گدائے عشق
اس کی گلی کی خاک مرے سر کا تاج ہو
ہونے لگا ہے چاک گریباں کسی کا پھر
تم بھی بہت حسین ہو نازک مزاج ہو
نفرت کو پال پوس کے کڑیل جواں کیا
مانگیں دعائیں اب کہ محبت کا راج ہو
ایسا حکیم کوئی مسیحا بتا جہاں
کانوں میں زہر جو گھلا اس کا علاج ہو

نیازت علی نیاز/لاہور

کوئی نہ دیکھے کہ پیڑ ہے سایہ دار کتنا
ہر اک اسے کاٹنے کو ہے بے قرار کتنا
اُتر گئے ہیں تو پاؤں رکتے نہیں کہیں پر
ہمیں خبر ہی نہ تھی کہ گہرا ہے غار کتنا
وہ آ گئی ہیں تو تختہ تختہ جدا ہے ابن کا
ہمیں خبر ہی نہ تھی کہ گہرا ہے غار کتنا
پرندے کل بے لباس پیڑوں سے کہہ رہے تھے
ہمیں ہے موسم بدلنے پر اختیار کتنا
تھکن کی گٹھڑی ہے سر پہ اور راستہ ہے ویراں
یہ کس سے پوچھیں یہاں سے ہے کوئے یار کتنا
رفاقتوں کی شکست ہے دل خراش احسنؔ
جو برف پگھلی اُداس تھا کوہسار کتنا

عارف احسن/لاہور

ہر چہرے میں اُس کا چہرہ دیکھے گا
دل، جیسا سوچے گا ویسا دیکھے گا
آنکھوں والو سوچو، سوچ کے بتلاؤ
اندھا خواب میں دیکھے تو کیا دیکھے گا
حاسد شخص کی ایک نشانی یہ بھی ہے
جل جائے گا جس کو ہنستا دیکھے گا
وہ میری تعریف کرے تو حیرت کیوں
اچھا تو ہر اک کو اچھا دیکھے گا
سارے جسم کو آنکھ بنا کر بھی دیکھے
پھر بھی دیکھنے والا کتنا دیکھے گا
تیری آنکھیں دیکھتا ہوں تو حیرت کیوں
جس کو پیاس لگی ہے، دریا دیکھے گا
مجھ کو دیکھنے کی خاطر شہباز کوئی
سب کی جانب جھوٹا موٹا دیکھے گا

ڈاکٹر شہباز نیرؔ/رحیم یار خاں

روٹھ کر یا مسکرا کر دیکھنا
بارشوں میں دل جلا کر دیکھنا
خوب صورت خواب ہوں گے ہم سفر
مجھ کو آنکھوں میں بسا کر دیکھنا
فرق کیا ہے بے خودی اور ہوش میں
آنکھ ساقی سے ملا کر دیکھنا
جان جاؤ گے مقدر کا مزاج
تاش کے پتے اُٹھا کر دیکھنا
لطف کیا ہے زندگی کا دوستو
غم کسی کا تم بٹا کر دیکھنا

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

دل دکھائے ستائے تصور ترا
پھر بھی رہ رہ کے آئے تصور ترا
دن کو بھی چین آرام کوئی نہیں
اور شب بھر جگائے تصور ترا
یوں تو ڈستی ہیں تنہائیاں آج کل
حشر سر پر اُٹھائے تصور ترا
یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے مگر
اب حقیقت میں بھائے تصور ترا
وصل کے خواب بھی ہیں سہانے بڑے
مجھ کو بھاتا ہے ہائے تصور ترا
یوں تو ہے جان لیوا خدا کی قسم
دل سے لیکن نہ جائے تصور ترا
شب کو چندا سے باتیں تصور کرے
دن میں تارے دکھائے تصور ترا

تصور اقبال/اٹک

جب اُس کی مسکان ملی ہے
میرے فن کو جان ملی ہے
آئی وعدے پر وہ لیکن
کر کے مجھے احسان ملی ہے
میں جب چونکا دیکھ کے اُس کو
بن کے وہ انجان ملی ہے
ہر کوئی شیدائی اُس کا
کیسی اُس کو شان ملی ہے
جب بھی میں گھر پہنچا اُس کے
کھولے ہوئے دیوان ملی ہے
اُس کا ذکر کیا جو میں نے
منزل بھی آسان ملی ہے
نغمہ گونج گیا ہے مجھ میں
تان سے اُس کی تان ملی ہے
عمر گنوائی فن میں شاقیؔ
تب جا کر پہچان ملی ہے

عقیل شاقیؔ/لاہور

بس دو گھڑی کے واسطے بیٹھے رہو گے تم
دل کی گزارشات کو سن کر اُٹھو گے تم
میری کتھا طویل سہی مانتا ہوں میں
اپنی کتھا کا کوئی تو قصہ کہو گے تم
یہ خام ہے خیال تیرا دور جاؤ گے
جا کر بھی دور دل میں یقیناً رہو گے تم
آئے نہ تم پلٹ کہ تو دل ٹوٹ جائے گا
آنکھوں سے اشک بن کر میرے ہاں بہو گے تم
دل کہہ رہا ہے تم نے جو دل کو لگا لیا
کیونکر بھلا یہ ہجر کے صدمے سہو گے تم
تم کو کتھا وقاصؔ نے اپنی سنائی گر
کہتا ہوں میں یقین سے کہ رو پڑے گے تم

وقاص انصاری/لاہور

آنکھیں ہیں نور نور نہ میلا کیا کرو
عورت ہو آپ آپ تو پردہ کیا کرو
اشکوں سے روز کرتا ہوں یہ گفتگو جناب
پلکوں پہ اب نہ آ کے تماشا کیا کرو
جب کاٹنا ہو دشت بلا کا سفر تمہیں
خود کو ہجوم شہر سے تنہا کیا کرو
کرنے کے بعد آئے اگر حرف ذات پر
ایسا کوئی بھی آپ نہ دھندا کیا کرو
محروم ہو گئے نا حسیں منظروں سے آپ
کس نے کہا تھا آنکھ پہ غصہ کیا کرو
مشکل سے آنکھ اُٹھتی ہے پہلے تمہاری سمت
تم دوسری طرف تو نہ چہرہ کیا کرو

اسد رضا سحر/احمد پور سیال

سوچ

سوچ محل کی
طویل راہداریوں میں
اُلجھنوں کی غلام گردشوں کے درمیاں
کبھی خیال کے جھروکے سے
کبھی کسی محراب کی جالیوں سے
نیچے جھانکتی خوفزدہ آنکھیں
اپنے ہونے پہ شرمندہ ہیں
طویل اترایوں اور گہرائیوں کے بیچ
ننگے ذہنوں والے
نازک ہڈیاں نچوڑتے درندے
سوچ محل کے پھاٹک پر
دربان ندارد
ٹوٹے کواڑوں پر
وحشت زدہ آنکھیں ہی آنکھیں
چھت سے دیواروں اور
دالانوں تک
نازک بدنوں کو برچھی کی مانند
چھیدتی چیرتی
مکروہ ہنسی ہنستی آنکھیں
گندگی خواہشوں کی بہتی رالیں
ان کے جبڑوں سے بہتی ہیں
ننگے بدنوں کی درندگی بڑھائے دیتی ہیں
کوئی تو ہو جوان خون تھوکتے لمحوں کو قید کرے
سوچ محل کی دیواروں سے باہر جھانک سکے کوئی تو ہو

آسناتھ کنول/لاہور

روشنی

خیالات کی تیرگی میں
جب انتشار روح کو جھلسانے لگا
اور رویوں کے مسموم پودے
ذہن پر کائی کی طرح جم گئے
اُداسی نے شریانوں میں بے کلی اُتار دی
لفظ بوجھل ہو کے اُنگلیوں سے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑنے لگے
کاغذ پر جمی ہوئی پھپھوندی قلم کی نوک سے اُلجھ اُلجھ کر تھک گئی
پوروں سے تھکاوٹ کا خون ٹپکنے لگا
تب بے نیازی کی اک کرن نے
میرے پورے وجود کو اچانک نور سے بسا دیا
میں نے ہجوم کرتے ہوئے وسوسوں کو جھٹکا تو
اک نئی صبح کے آثار ہویدا ہوئے

ڈاکٹر سائرہ بتول/اسلام آباد

ناول ''کماری والا''

تبصرہ نگار: شہناز نقوی

علی اکبر ناطق کا دِل کو چھو لینے والا یہ ناول ''کماری والا''

اِس ناول کو بُک کارنر جہلم نے شائع کیا ہے۔ عُمدہ طباعت سے آراستہ اور کمال پروف ریڈنگ کی بدولت پڑھنے میں جو سُرور ملا وہ اپنی جگہ اہم ہے۔ اس ناول کا اِنتساب تخلیق کار نے اپنے مرحوم بھائی اور مرحومہ بہن کے نام کیا ہے۔ جس دِن سے یہ ناول ہاتھ میں آیا شام سے رات گئے تک دلچسپی سے پڑھے جارہی تھی اور نیرنگ ءزمانہ کے حیرتوں کے سمندر میں ڈوبی جارہی تھی۔ کسی بھی تحریر کو اَرفع کرنے کے لیے قلم سے زیادہ خونِ جگر کی روشنائی چاہیے ہوتی ہے۔

اعصاب شکن مراحل سے یوں گزر کر ہی ایک ''تخلیق'' اپنا وجود منواتی ہے۔

اب آیئے اِس ناول کی طرف جسے ایک حساس فِکشن نگار نے تحریر کیا ہے۔ جس کی سوچ کی سرحدیں اتنی وسیع ہیں کہ ہر کسی کے نصیب میں اُن کو چُھونا شاید ایک خواب ہی رہ جائے۔ ہر عمدہ تخلیق کار اپنے منفرد انداز، مشاہدے اور خداداد وسعتِ نظری کے ساتھ انسان اور کائنات کو دیکھتا اور سوچتا ہے یہی قدرت کا انمول تحفہ اِن کو دوسرے عام انسان سے بالا کر دیتا ہے۔ مجھے اس ناول کا بے چینی سے اِنتظار تھا کیوں کہ میں بہت عرصہ اسی اُسلوب کو ڈھونڈتی رہی!! دراصل کلاسکس کو پڑھنے کے بعد پھر مجھے کم کم اُسلوب نے متاثر کیا۔

اِس ناول میں محبت، مروّت سیاسی، سماجی، ثقافتی حوالے سے استحصالی رویّوں پر جس کمال مہارت سے قاری کو آشنا کروایا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ زبان وبیان اتنا نیچرل اور رواں ھے کہ ہر لفظ اپنی تاثیر لیے قاری کو کہانی کے ساتھ دوست بنا کر لیے پھرتا ہے کہ دیکھو یہ ھے زندگی کے اُتار چڑھاؤ اور یہ ہے انسانوں کے ہجوم میں سوچ کے اعلیٰ و ادنیٰ معیار!

انسان کی ایسی بے خبری اور خود پسندی کہ وہ اپنی ذات ہی کے ایسے دائرے بنا کر سلگتے ایندھن میں اپنے ہی رشتوں کو سوکھی لکڑیوں کی صورت پھینکتا چلا جاتا ھے اور آگ کے شدید بھڑکنے سے اپنی جھوٹی اَنا کی تسکین کرتا ھے اور پھر بھی اس کے ہاتھ خالی کے خالی ہی رہ جاتے ہیں۔

ناطق الفاظ کا کاریگر تو ہے ہی مگر جس طرح پورے ناول میں قاری کو ایک زمانے سے دوسرے زمانوں تک آشنا کروا دیتا ہے یہ کمال مہارت اُسی کا خاصہ ہے۔ ناول میں خواتین کے جذبات اور کردار، نفسیات کی جس طرح تصویر کشی کی گئی ہے اس کا تو جواب ہی نہیں۔ چاہے وہ عدیلہ کے دُکھ ہوں ہو یا ڈاکٹر فرح کی قسمت، زینی کے مقدر، دادی اور والدہ کی بے لوث محبت خلوص، شیزا کے اطوار اور پسِ پردہ ناکردہ گناہ کی نفسیاتی محرومیاں تمام مناظر کو الفاظ کے برش سے شاندار طریقے اور سلیقے سے برتا گیا ہے۔ جذئیات نگاری تو تخلیق کار کے عمیق مشاہدے کے داد کی مستحق ہے۔ ناول میں موجود تمام مناظر قاری کو ایسے جوڑے رکھتے ہیں کہ جیسے ہم بھی لکھاری کے ہمراہ ہوں۔ ناول کے ہر موڑ پر عمدگی سے تاریخی حوالہ جات اور موقع کی مناسبت سے محاورات کا استعمال یہ سب قاری کے ذہن دل کو ایک آہٹ کی طرح متاثر کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی منفرد انداز ہی تو فکشن کا حُسن ہے۔ علی اکبر ناطق کے اِس ناول ''کماری والا'' کو پڑھتے ہوئے کچھ کردار تو یوں محسوس ہوئے جیسے یہ کہانی ہماری ہی ہو بلکہ دنیا کے ہر انسان کی!

یہ ناول اپنی زبان دانی، روانی کہانی میں کلیوں کی مہک سا ہے جو آج کے کثافت زدہ رویّوں میں کمال لطافت اپنے پروں میں لئے جانب پرواز ہو. دراصل یہ ناول جسے میں نے اپنی بصیرت کے مطابق سمجھا کہ ہر سطح پر رشتوں کی پامالی، بے حسی، معاشی حق تلفی سماج اور دُنیا کے حُسن کو پامال کر دیتی ہے۔ گلوبل ویلیج کے بدلتے ثقافتی ادوار

کو بھی ناول کے آخری ابواب میں دلنشیں انداز کے ساتھ کئی رنگوں میں پینٹ کیا گیا۔

واقعی اس ناول کی ہر سطر کمال اور اس کی تاثیر خود بتا رہی ہے کہ اُردو اَدب میں علی اکبر ناطق ایک ''عہد'' کا نام ہے۔ مجھے تو اپنے من پسند اُسلوب میں یہ فِکشن پڑھ کر خوشی ہوئی ورنہ تو زندگی میں بہت کتابوں کو ہاتھ میں لیا اور واپس رکھ دیا۔

سلامت رہے یہ دِلوں کو گھائل کرنے والا تخلیق کار زندگی کے رنگوں کو یوں ہی کتابوں میں سمیٹتا رہے۔

بُک کارنر شوروم جہلم نے شاندار انداز میں شائع کیا ہے اور اس کی قیمت بارہ سو روپے ہے. آج آرڈر کریں تو اگلے دن آپ کے پاس ہو گی یہ کتاب... گگن شاھد اور امر شاھد بہترین کتاب دوست اور عمدہ پبلشر ہیں انہوں نے شائع کیا ہے یہ ناول... تمام احباب سلامت رہیں.....

آپ تمام دوست ضرور پڑھئے. ناول دیکھنے میں ضخیم ضرور ہے مگر پڑھنے میں مہکتی اٹھلاتی، جھومتی ہواؤں جیسا.....

مسیحا

فخر زمان

کامی کا آج کام پر پہلا دن تھا۔ اس کا باس اسے صحیح طرح سے تیار کر کے شہر کے باہر اس جگہ چھوڑ آیا جہاں اسے سارا دن کام کرنا تھا۔ اور شام کو اسے واپس بھی مالک ہی لے کر آتا تھا۔ کامی سارا دن اسی ٹوٹی پھوٹی سڑک کے بیچوں بیچ بیٹھا ہر آتے جاتے سے صرف ایک ہی سوال کرتا تھا۔ "اللہ کے نام پہ کچھ دے دے بابا۔۔۔ اللہ تیرا بھلا کرے گا"

گاڑیوں میں گزرتے لوگ گاڑی روک کر دس بیس روپے اس کی جھولی میں ڈال دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔ بعض غرور اور حقارت میں گاڑی روکنا بھی گوارا نہ کرتے اور پیسے پھینک کر نکل جاتے جو اکثر کامی تک نہیں پہنچ پاتے تھے بلکہ ہوا کے دوش پر کہیں دور اڑ جاتے۔ یوں کامی کے لبوں تک پہنچا رزق بھی کسی کے تکبر کے باعث اس کے منہ سے چھن جاتا۔ لیکن وہ معصوم سی نگاہوں سے سب کو سلام کہہ دیتا اور اپنی قسمت پر شاکر رہتا۔ اس کے لبوں پہ بس ایک ہی بات ہوتی "ہاں۔۔۔ بھلا کر تیرا بھلا ہوگا"

اکرام عرف کامی کی عمر ابھی 6 سال تھی جب اسے گلی میں کھیلنے کے دوران اغوا کر لیا گیا تھا۔ اغوا کاروں نے چند دن تو اسے خوب خاطر مدارت سے رکھا لیکن بعد میں اپنے مالک کے حکم سے اس کی ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ کاٹ دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسے جسمانی سزائیں بھی دی جاتی رہیں۔ خاص طور پر اس کے سر میں ایسی چوٹیں لگائی گئیں جن سے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ ایسا صرف اس کے ساتھ ہی نہیں ہوا تھا بلکہ اس جیسے کئی بچوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔ جنھیں ملک کے مختلف حصوں سے اغوا کر کے خاص طور پر تیار کیے گئے عقوبت خانوں میں لایا جاتا تھا اور پھر وہاں ان کو ذہنی و جسمانی طور پر معذور کر کے ان سے اسی قسم کا دھندا کروایا جاتا تھا۔ ان بچوں میں سے کبھی کسی کی ایک یا دونوں آنکھیں ضائع کر دی جاتیں تو کبھی کسی کی زبان کاٹ دی جاتی۔ اغوا کی جانے والے لڑکیوں سے ان کی خوبصورتی کی بنا پر کام کروایا جاتا۔ جیسے ہی وہ بلوغت تک پہنچتیں، انھیں بڑے بڑے سرکاری عہدہ داروں کے بنگلوں اور بعض اوقات بیرون ملک سے آئے ہوئے شاہی مہمانوں کی تسکین کے لئے بھیجا جاتا۔ بعض دفعہ کسی خوبصورت لڑکی کی آنکھ کو زائل کر کے اسے زیادہ قابل ترس اور قابل رحم بنا دیا جاتا۔ ہر روز صبح سویرے منہ اندھیرے گامن (باس) کامی اور دوسرے بچے بچیوں کو مقررہ جگہ پر چھوڑ آتا اور رات گئے ان کو واپس جھونپڑی میں لے آتا۔ کبھی کبھار وہ بیچارے خود ہی کسی نہ کسی طرح واپس آجاتے۔ چونکہ ان کے پاس گامن کے سوا کوئی سہارا نہ تھا اس لیئے اس دنیا میں وہی ان کا واحد مسیحا تھا۔

لاہور کے نواح میں ڈوموں کی ایک بستی تھی جس میں گامن کا بسیرا تھا۔ گامن ایک کالا سا، موٹا سا ڈوم تھا جو اپنے بھدے سے جسم پر بنیان اور تہبند باندھے اپنی جھونپڑی میں بچھی دری پر نیم دراز بیٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا جبکہ اس کا موٹا سا پیٹ بنیان کی قوتِ برداشت سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے سامنے منظور عرف جُورا اور عظمیٰ عرف عُجاں سہمے ہوئے اس کی باتیں سُن رہے تھے۔ اور "جی سردار۔۔۔ جی سردار" کا ورد کیے جا رہے تھے۔ گامن ان سے اس بات پر الجھ رہا تھا کہ کامی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔ "دیکھو بھائی! اس کی جگہ اس سے پہلے جس لڑکے کو بٹھایا تھا وہ اس سے دوگنی کمائی کر کے لاتا تھا مگر کامی کو جیسے کوئی کچھ دینے کو تیار ہی نہیں۔ اسے کام دھندا کرنا نہیں آوے ہے۔ اگر ایسا ہی رہا تو۔۔۔ صاف بات ہے لالے۔۔۔ میں اس کو کسی دوسرے شہر میں چھوڑ آؤں گا۔" گامن کی رعونت بھری اس بات سے جُورا اور عُجاں اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے "جانے دیں مالک۔۔۔ کامی ابھی بچہ ہی تو ہے۔ سیکھ جائے گا آہستہ آہستہ"۔ "ہوں۔۔۔" گامن نے ایک پھنکار بھرتے ہوئے ہوس زدہ نگاہوں سے عجاں کا جسم ٹٹولا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے رال ٹپکائی۔ "تم کہتی ہو تو میں جانے دیتا ہوں عُجاں ں ں۔۔ لیکن اگر اگلے ہفتے تک کامی دوگنی کمائی کر کے نہ لایا تو مجھے ضرور اس کی رپورٹ اوپر دینا ہوگی۔"

☆☆☆

سیٹھ اجمل آج بہت خوش تھے۔ ان کی خوشی سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔ دفتر کے تمام ملازمین میں بھی خوشی کی لہر دوڑ چکی تھی۔ سب لوگ خوش تھے خوش کیوں نہ ہوتے اللہ نے سیٹھ اجمل کو خوشی ہی اتنی بڑی عطا کی تھی۔ شادی کے 15 سال بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں بیٹا عطا کیا تھا۔ دفتر میں ہر کوئی خوش تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آخر کار سیٹھ اجمل کے نیک اعمال کا صلہ دنیا میں بھی عطا کر دیا۔ فرحان میاں ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ اور مٹھائی کا ڈبہ لیے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہی اندر آن ٹپکے اور سیدھا سیٹھ اجمل سے بغل گیر ہو گئے۔ اس دن سیٹھ اجمل اور اس کے ملازموں اور عملے کے درمیان پیشہ ورانہ فاصلہ قریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سب ملازمین سے گھل مل چکے تھے۔ فرحان میاں تو چلو ان کے سیکرٹری تھے۔ لیکن اشرف چاچا جو کہ ایک معمولی نائب قاصد تھا، سیٹھ اجمل اس سے بھی گلے ملے اور ڈھیروں مبارکباد وصول کی۔ "صاحب! اللہ کی ذات بڑی بے نیاز ہے

اس نے آپ کے نیک اعمال کا پھل اسی دنیا میں آپ کو بیٹے کی صورت میں عطا کر دیا ہے" سیٹھ اجمل رسمی مسکراہٹ سجائے سب کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

"فرحان میاں! میں سوچ رہا ہوں کہ اس عظیم خوشی کے موقع پر میں ایسا کام کروں جو آج تک کسی نے نہ کیا ہو" سیٹھ اجمل نے والہانہ انداز میں کہا۔ ''وہ کیا سر؟'' فرحان میاں نے فوراً متجسس ہو کر پوچھا۔" میں سوچ رہا ہوں کہ شہر کے جتنے بھی غریب لوگ ہیں سب کو کھانا کھلایا جائے"۔۔'' واہ! بہت اعلیٰ سوچ ہے آپ کی سر۔ بالکل بجا فرمایا۔۔ یہ بہت بڑی نیکی ہے۔'' فرحان میاں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔" بس تم یہ معلوم کرو کہ شہر میں کون کون سے علاقے غریبوں پر مشتمل ہیں، پھر فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے" سیٹھ اجمل گویا ہوا۔" سر یہ کام کافی مشکل ہے کیونکہ جس شہر میں ہم رہ رہے ہیں یہاں سبھی امیر لوگ رہتے ہیں۔ ہاں لیکن ایک راستہ ہے میرے پاس۔۔۔شہر کے باہر ڈوموں کی ایک بستی ہے جس میں زیادہ تر خانہ بدوش، بھکاری اور انتہائی غریب لوگ رہتے ہی میرا خیال ہے کہ ان سے زیادہ آپ کی خیرات کا حق دار اور کوئی نہیں ہوسکتا۔'' فرحان میاں نے بڑے دردمندانہ لہجے میں بات کی۔'' تو پھر ٹھیک ہے تم آج ہی دس بارہ دیگیں بریانی اور قورمہ کی تیار کرواؤ اور اس بستی کے لوگوں میں تقسیم کردو اور ساتھ ہی یہ اعلان کرنا کہ سیٹھ اجمل کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اس کی خوشی میں آج کا کھانا ان کی طرف سے ہے۔'' (یہ سب باتیں اشرف چاچا بڑے انہماک سے سن رہا تھا)

☆☆☆

فراٹے بھرتی گاڑی سڑک کے کنارے آن رُکی اور اندر سے فرحان میاں نکل کر اس بستی کی طرف چل دیئے۔ کچھ دور جا کر وہ ایک بڑی اور قدرے صاف جھونپڑی کی طرف چلنے لگے۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ بنا دستک دیئے جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ فرحان میاں کو اندر آتے دیکھ کر گامن نے اپنا لباس ٹھیک کیا اور قدرے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور فرحان میاں کے کچھ بولنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔'' کہیئے صاحب! آج ہم غریبوں کی کُٹیا میں کیسے آنا ہوا؟ سب خیر تو ہے نا؟؟؟'' گامن نے مصنوعی حیرانی دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ورنہ وہ جانتا تھا کہ فرحان میاں جیسا کایاں آدمی کسی مطلب کے بغیر ادھر کا رخ کبھی نہ کرتا۔'' گامن آج بڑی خوشی کی بات ہے۔ سیٹھ اجمل کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اس خوشی میں آج تمہارے سارے قبیلے کے لئے کھانا لے کر آیا ہوں۔ باہر گاڑی میں دیگیں رکھی ہیں۔'' گامن فرحان میاں کی بات سن کر بڑا حیران ہوا اور کسی حد تک خوش بھی ہوا۔ اس نے اس کی بات مانتے ہوئے دو تین آدمیوں کو اس کے ساتھ بھیجا اور وہ کھانا قبیلے کے لوگوں میں بانٹ دیا۔ خوب فوٹو سیشن کیا گیا جو اگلے دن کے اخباروں کی زینت بنا۔

☆☆☆

"صاحب! کوئی شفیق نام کا آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ چوکیدار نے مؤدب انداز میں سیٹھ اجمل کو اطلاع دی۔" ٹھیک ہے اسے آنے دو اندر" سیٹھ اجمل نے صوفے پر ٹیک لگائی اور ٹانگوں پر ٹانگ رکھ کر روکھا جواب دیا۔" السلام علیکم اجمل صاحب!'' آنے والے نے مؤدبانہ سلام کیا تو سیٹھ اجمل نے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور اشارے سے ہی شفیق کو اپنے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا کہا۔ شفیق ہچکچاتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔'' جی شفیق صاحب! فرمایئے۔۔ کیسے زحمت کی؟'' اس بار سیٹھ اجمل نے قدرے نرمی سے پوچھا۔ شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ آنے والا اس کی شخصیت اور رکھ رکھاؤ سے متاثر ہو چکا ہے۔'' ماشاء اللہ بہت نام سنا ہے آپ کا اور آپ کے ادارے" اجمل ویلفیئر ٹرسٹ کا" ماشاء اللہ آج تک آپ نے لاکھوں یتیم اور لاوارث بچوں کی کفالت کی ہے۔ سینکڑوں اغوا ہو جانے والے بچوں کو بازیاب کروا کر ان کے لواحقین کے سپرد کیا ہے۔ اللہ آپ کا اقبال بلند کرے"۔ اجمل اس طویل تمہید سے بیزار نظر آنے لگا تو شفیق سیدھا مدعا پر آیا۔۔'' میری صرف اتنی سی عرض ہے کہ کچھ سال پہلے میرا بیٹا کسی نے اغوا کر لیا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود ہمیں اس کا نام ونشان تک نہیں مل سکا۔ آخر کار ہم بڑی کوششوں اور مشکلوں کے بعد آپ تک کراچی پہنچے ہیں۔ اب میری آخری امید آپ اور آپ کا ادارہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے بیٹے کو ضرور ڈھونڈ دیں گے''۔ شفیق نے لجاجت سے التجا کی۔'' ہوں۔۔۔۔ کیا نام ہے آپ کے بچے کا؟ اور کب اغوا ہوا تھا؟'' سیٹھ اجمل نے آنکھیں بند کر کے شفیق سے پوچھا۔'' جی اکرام نام تھا اس کا (چھ سال کی عمر میں اغوا ہوا تھا آج پانچ سال ہو گئے ہیں) لیکن اس کو سب پیار سے کامی بلاتے تھے۔۔۔ خدا کے لئے سیٹھ صاحب میرا بیٹا مجھ سے ملوا دیں اللہ تعالیٰ آپ کا مقام و مرتبہ اور بلند کرے۔'' شفیق صوفے سے اٹھ کر سیٹھ اجمل کے قدموں میں آ بیٹھا تو سیٹھ نے فوراً آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔'' اس کی کوئی تصویر ہے تو دے دو، میں کوشش کروں گا'' سیٹھ اجمل نے سپاٹ انداز میں کہا تو شفیق نے کرام کی تصویر سیٹھ اجمل کی طرف بڑھا دی۔'' ہم مم مم۔۔۔'' تصویر دیکھ کر سیٹھ اجمل نے سر صوفے کی پشت سے ٹکایا اور شفیق کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ'' گھبراؤ نہیں۔۔ ان شاء اللہ۔۔ آپ کا بیٹا مل جائے گا۔ آپ دعا کریں"

☆☆☆

" گامن! میری بات دھیان سے سُنو۔ میں بہت شریف آدمی ہوں اور دو نمبر کام بھی بہت ایمانداری سے کرتا ہوں۔ اور پورے ملک میں میری عزت اور شہرت ہے۔ پانچ سال قبل خانیوال سے جو بچہ تم اٹھا کر لائے تھے اب اسے اس کے لواحقین کے حوالے کرنے اور دعائیں لینے کا وقت آ گیا ہے۔ اور ویسے بھی اب وہ ہمارے کسی کام کا نہیں رہا۔'' "جی حضور!

میں سمجھ گیا" گامن نے ہاتھ باندھے عرض کی۔ "اس بچے کے والدین اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسی شہر میں آ چکے ہیں۔ اور کل اس کا والد اپنے بچے کے اغوا ہونے کی فریاد لے کر میرے پاس آیا تھا۔'' سیٹھ اجمل نے صورت حال سے آگاہ کیا۔'' گامن! تم ایک کام کرو۔۔کل ہی اس بچے کو لے کر دوسرے شہر (لیہ) چلے جاؤ۔ اگلا کام میں خود کرلوں گا۔'' گامن یہ ہدایت سن کر سلام کرتے ہوئے دفتر سے نکل گیا۔ چند روز بعد حسب معمول ٹی وی پر ایک تصویر دکھائی گئی جس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ یہ بچہ لیہ کے نزدیک سے ملا ہے۔ جس کسی کا ہو وہ "اجمل ویلفیئر ٹرسٹ لیہ" سے اسے حاصل کرسکتا ہے۔ یا وہ دیئے گئے نمبر پر رابطہ کرسکتا ہے۔

سیٹھ اجمل کے ایک ملازم نے اس شخص کو کال کر دی جو چند روز قبل سیٹھ اجمل سے اس کے دفتر میں ملا تھا۔" آپ کا بچہ مل چکا ہے، آپ "اجمل ٹرسٹ لیہ" تشریف لا کر اپنے بچے کو لے جاسکتے ہیں۔ حقیقت سے بے خبر شفیق ۔۔۔نے سیٹھ اجمل اور اس کے ادارے کو ڈھیروں دعائیں دیں۔ اس نے روتے ہوئے اپنے بیٹے کو سینے سے لگایا۔ بیٹا حواس کھو چکا تھا اس لئے اس کو احساس تک نہ ہوا کہ وہ اپنے باپ کے سینے سے لگا ہوا ہے۔ باپ روتے روتے غش کھا رہا تھا۔ اجمل ٹرسٹ کے عملے نے اسے حوصلہ دیا اور ضروری کارروائی کے بعد اکرام کو اس کے والد کے حوالے کردیا۔ شفیق آنسوؤں کے موتی اس ریت پر بہا کر رخصت ہوا۔

☆☆☆

چند ماہ بعد میڈیا پر ایک خبر چلی'' آج کی سب سے بڑی خبر" ملک کے سب سے بڑے اور معروف سوشل ورکر ہزاروں یتیم اور لاوارث بچوں کی کفالت کرنے والے سیٹھ اجمل کے بیٹے کو کسی نے اغوا کر لیا"۔ اس خبر نے پورے ملک میں تہلکہ مچا دیا۔ سیٹھ اجمل اپنی پوری کوشش کے باجود اپنے بیٹے کو بازیاب کرانے میں ناکام رہا۔ پولیس، فوج اور رینجرز ہر ادارے سے مدد لینے کے باوجود شہیر (اجمل کے بیٹے) کی کوئی خبر نہ تھی۔ سیٹھ اجمل اب بہت پریشان تھا۔ ہر ٹی وی چینل پر، ہر اخبار میں، ریڈیو سٹیشن میں شہیر کی بازیابی کے لئے اشتہار دیا گیا۔ اور شہیر کو بازیاب کرانے والے کے لئے لاکھوں کا انعام بھی رکھا گیا۔ لیکن بے سود۔۔۔۔۔۔۔

سیٹھ اجمل اپنی پوری کوشش کے باوجود بیٹے کو بازیاب نہ کروا سکا۔ اور اب اس نے بالکل ہی امید کی شمع بجھا دی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ شاید اب تک وہ مر چکا ہوگا۔

فرحان میاں اور سیٹھ اجمل ایک دن کسی کام سے بہاولپور جا رہے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا اور انھوں نے گاڑی کا اے۔سی فل سپیڈ پر چلا رکھا تھا۔ جبکہ باہر کی گرمی کا یہ عالم تھا کہ ہر چیز گویا آگ میں جل رہی تھی۔ صحرائی علاقے کا درجہ حرارت کوئی 50 درجے تک پہنچ چکا تھا۔ گرمی کی اس شدت میں شکست خوردہ سڑک کے بیچوں بیچ ایک کم عمر بچہ جس کا ایک بازو اور ایک ٹانگ نہیں تھی۔ اپنے اکلوتے ہاتھ کی شہادت انگلی کھڑے کئے صرف ایک ہی اشارہ کر پا رہا تھا جس کا مطلب بالکل واضح تھا" اللہ کے نام پہ کچھ دے دو بابا" سیٹھ اجمل اور فرحان کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اس طرح کے کے مناظر وہ قریباً ہر روز ہی دیکھتے تھے۔ لیکن اس دن اس بچے کو دیکھ کر اچانک سیٹھ اجمل کا پاؤں گاڑی کی بریک پر جم گیا۔ وہ گاڑی سے نیچے اترا اور بھاگ کر اس بچے کے قریب گیا۔ جیسے اس کے قریب پہنچا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ شہیر کو اس حال میں دیکھ کر وہ غش کھا کر گر گیا۔ شہیر کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا:"ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا"۔

یہ سارا منظر دیکھتے ہی فرحان میاں نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔

شازیہ رباب/ملتان

یوں شوخی غزلوں کی مر رہی ہے
اُداسی دل میں اُتر رہی ہے

اندھیرا اتنا ہے میرے اندر
کہ روشنی اس سے ڈر رہی ہے

ملے کبھی تو میں اس سے پوچھوں
اے زندگی! تو کدھر رہی ہے؟

کوئی تو ہو جو مجھے خبر دے
کہ میری کیسے گزر رہی ہے

کہاں ہے اُتری تھکن یہ کل کی
جو شام پھر پاؤں دھر رہی ہے

کہاں ہو تم میرا ہاتھ تھامو
کہ میری ہستی بکھر رہی ہے

یہ لمس کی جو طلب ہے پیارے
یہ قربتوں کا ثمر رہی ہے

ہو جو محبت میں وصل ممکن
وہ آرزوئے بشر رہی ہے

ڈھائی کنال کی جنت

پروفیسر نور کمال شاہ

لچکتی شاخوں پہ پھدکتی ہوئی چڑیوں نے اپنے پر تیزی سے پھڑ پھڑائے تو درخت کی گھنی بار دار ٹہنیوں سے امرود کے دو تین پکے پھل نیچے گر کر لڑھکتے ہوئے بہتے نالے کے کنارے جا کر رک گئے ، ساتھ ہی درخت پر موجود پرندوں کی بے معنی چہچہاہٹ تیز ہو کر شور میں تبدیل ہوگئی - شائد چڑیاں آپس میں لڑ پڑی تھیں - عمر خان شفاف پانی کے تنگ و تیز بہتے دھارے کو پھلانگ کر پار کرنے کے بعد دوسری جانب گیا اور کنارے کنارے دس پندرہ قدم آگے جا کر اس کھالی تک جا پہنچا جہاں سے پانی کا رخ موڑ کر اسے پتلی سی کچی نالی کے زریعے اس کے کھیت تک پہنچایا جاتا تھا - اس کا چھوٹا سا کھیت پہاڑ کے دامن میں پانی کے بڑے نالے کے کنارے ڈھلوانی سطح کے نیچے واقع تھا اور اس نالے میں اوپر پہاڑ کی بلندی پر واقع چشموں سے مسلسل پانی نیچے بہتا رہتا تھا - کھرپے کی مدد سے نالی کے دہانے لپی مٹی ہٹا کر اس نے دہانہ کھول دیا اور بڑے پہاڑی نالے سے کچھ پانی تیزی سے پتلی نالی میں سے نیچے بہنے لگا - پانی کا رخ کھیت کی جانب موڑ کر عمر خان پہاڑی نالے کے آس پاس کھڑے گھنے خودرو پودوں اور پھلدار ٹہنیوں سے الجھتا بچتا ہوا نیچے اپنی کھیت کی جانب اترنے لگا - سرخ پکے آلوچے اور چڑیوں کے چونچوں سے کٹے کترے چند خوبانیاں بھی نیچے گر کر نالی کے پانی کے اندر تیر رہی تھیں اور کچھ کنارے آس پاس کیچڑ میں پڑی تھیں - پانی پھتریلی پہاڑی نالے میں اچکتا، جھپٹتا الجھتا اور سرکتا ہوا نیچے کھیت کی جانب تیزی سے نکل رہا تھا - ایک بڑے ہموار افقی چٹان کے اوپر پہنچ کر عمر خان رک گیا - یہاں سے کھیت تک پہنچنے والی قدم قدم بل کھاتی ہوئی پتلی نالی آخر تک صاف نظر آ رہی تھی - عمر خان پندرہ بیس گز نیچے اپنے چھوٹے سے ہرے بھرے کھیت میں پانی پھیلنے کا نظارہ دیکھنے لگا - پیشانی پر موجود گہری شکنیں اس کے فکرمندی و غمگینی کی غمازی کھا رہی تھیں - دکھ اس کے بوڑھے چہرے سے جھلک رہا تھا - دیر تک وہ اسی انداز سے اپنے چھوٹے سے کھیت کو دیکھتا رہا جو جوار اور باجرے کی زرخیز فصل سے لہک رہا تھا - دو کنال کا چھوٹا سا کھیت جس کے کنارے کنارے پھلدار پودوں کی بار دار جھکی شاخیں اویزاں تھیں اور پہاڑی انگور کے خوشے پک کر نیچے لٹک رہے تھے - آج اس کھیت کی مستقبل کا فیصلہ ہونا تھا - ظہر کی نماز کے بعد جرگے کے مشران اس کھیت کے بارے میں فیصلہ کرنے والے تھے -

سوچوں کی یلغار میں پھنسا جہان دیدہ عمر خان ہموار چٹان کے اوپر بیٹھ کر گہری سوچوں میں ڈوب گیا - وہ بھی کیا سہانے دن تھے جب وہ اپنے بابا کے ساتھ اکثر اس کھیت میں آیا کرتا تھا - گاوں کے آس پاس ان کی دیگر زمینیں بھی موجود تھیں مگر خدا جانے اس دو ڈھائی کنال کے زمین کے ساتھ ان کا کون سا ایسا دیرینہ رشتہ تھا کہ جب بھی موقع ملتا، وہ ادھر ہی دوڑے چلے آتے - شائد اس تعلق کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ کھیت ان کے گھر اور گاوں کے بہت قریب پڑتا تھا - بابا کے بعد اب عمر خان بھی اس تعلق کو اسی طرح نبھا رہا تھا - کھیت بھی ان کے خلوص و محبت کا جواب شاندار پیداوار کی صورت میں دے رہا تھا -

عمر خان اپنے باپ کا بڑا بیٹا تھا - اس کا چھوٹا بھائی ظفر خان اس سے پانچ سال چھوٹا تھا - ان کے درمیان ایک بہن تھی - یہی تین بچے یعقوب خان کا کل اثاثہ تھے - یعقوب خان ایک دفتر میں سرکاری ملازم تھے اور ساتھ ہی ساتھ گاوں میں اچھی خاصی دکان بھی چلا رہے تھے - مدد کیلئے ایک ملازم بھی دکان میں ساتھ رکھا ہوا تھا - اچھی خاصی کمائی کی بدولت خوشحال زندگی گزار رہے تھے - اپنے بچوں کو اس نے بہترین سکولوں میں پڑھایا اور انہیں کامیاب انسان بنانے کی پوری کوشش کی - مگر زندگی نے وفا نہ کی اور بچوں کا تعلیمی سلسلہ ختم ہونے سے بہت پہلے وہ ملک عدم کو سدھارے - باپ کے مرنے کے بعد عمر خان کو اپنا تعلیمی سلسلہ ترک کرنا پڑا مگر اپنے چھوٹے بھائی ظفر خان کو وہ برابر دل جمعی سے پڑھاتا رہا - باپ کی ذمہ داریاں اب اس کے کندھوں پر تھیں اس لئے اس نے اپنے چھوٹے بہن بھائی کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں آنے دی - چلتے کاروبار اور والد کے پینشن کو ملا کر خاصی آمدن ہو رہی تھی جس میں سے گھر کے اخراجات اور بہن بھائی کے تعلیم کا خرچہ آسانی سے نکل آتا - اپنی شادی کے بعد عمر خان نے بھائی کا رشتہ بھی اچھے خاندان میں طے کر دیا تھا مگر رخصتی کو تعلیم کی تکمیل سے مشروط کر دیا تھا - اس نے بہن کی مرضی سے اس کی بات بھی پکی کرا دی تھی - بہن کی شادی بھی اس نے جلد ہی کرا دی کہ اس نے کون سی نوکری کرنی تھی - اس لئے شادی کے عمر کو پہنچتے ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دیئے - اخراجات بڑھنے پر کچھ زمین بھی بیچ دی گئی -

ظفر خان پڑھتا رہا اور تعلیم پوری کر کے بڑے سکول میں استاد لگ گیا - اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے بعد اس کی شادی کر دی گئی اور اپنی زمینوں

میں سے ایک قطعہ الگ کر کے اس کے لئے جدا گھر تعمیر ہوا کیونکہ موجودہ گھر دونوں بھائیوں کے لئے ناکافی تھا - یوں اب عمر خان اور ظفر خان فاصلے پر واقع الگ الگ گھروں میں اپنے اپنے کنبے کو پال رہے تھے اور اپنے آمدن وخرچ کے خود اکیلے ذمہ دار تھے - گاؤں میں جو زمینیں تھیں اس میں سے تقریباً" تینوں بہن بھائیوں کو تھوڑا بہت حصہ ملا ہوا تھا اور وہ اسے بیچ کر اپنے استعمال میں لا چکے تھے - صرف دو ڈھائی کنال کا یہ چھوٹا سا کھیت عمر خان کے قبضے میں رہ چکا تھا اور وہ شائد بہن بھائی اور خاندان کے لئے اپنی خدمت گزاری یا خاندان کا بڑا ہونے کے سبب اسے اپنا حق تسلیم کر چکا تھا - یہی کھیت بہن بھائیوں کے درمیان رنجش اور دشمنی کا سبب بن چکا تھا - ظفر خان اور اس کی بہن اس کھیت میں سے اپنا حصہ مانگ رہے تھے - انہوں نے اپنا مطالبہ اپنے بھائی عمر خان تک پہنچا دیا تھا مگر پتہ نہیں کیوں، عمر خان نے ان کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی - بہن نے تو ناراضگی کا راستہ اپنا کر عمر خان کے گھر آنا جانا بند کر دیا مگر ظفر خان صرف ناراضگی سے معاملہ ختم کرنے کے حق میں نہیں تھا - چنانچہ گاؤں کے معززین اور بزرگوں کو بیچ میں لا کر وہ عمر خان کو اس زمین سے دستبردار کرنے کی کوشش میں لگ گیا - اور آج گاؤں اور آس پاس کے بزرگ جرگے کے زریعے اس معاملے کا فیصلہ کرنے والے تھے -

عمر خان اب ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر تک پہنچ چکا تھا اور کافی خوشحال زندگی گذارتا آیا تھا - اس کا ایک بیٹا نسیم خان شہر میں بڑا ڈاکٹر لگ چکا تھا اور اچھی خاصی کمائی کر رہا تھا جبکہ دوسرا اس سے چھوٹا لڑکا اپنا کاروبار چلا رہا تھا - دونوں کی آمدنی ملا کر نہ صرف ان کی گزر بسر اچھے سے ہو رہی تھی بلکہ بہت کچھ پس انداز بھی ہو جاتا - نسیم خان کا رشتہ بچپن ہی میں ظفر خان کی بیٹی کوثر سے طے ہو چکا تھا - مگر دونوں بھائیوں کے درمیان بگڑتے تعلقات کی وجہ سے اس رشتے کو برقرار رکھنا کافی مشکل ثابت ہو رہا تھا - کوثر تعلیم مکمل کرنے کے بعد قصبے کے کالج میں لیکچرار لگ گئی تھی - کوثر اور نسیم خان اس رشتے سے نہ صرف راضی تھے بلکہ وہ ایک دوسرے کی پسند بھی تھے - بگڑتے تعلقات کا سب سے زیادہ دکھ ان کو تھا -

گھر میں کشیدہ حالات کے باوجود نسیم خان کا اپنے چچا کے ہاں آنا جانا تھا اور جب بھی وہ چھٹی پہ گاؤں آتے تو باپ کی نظروں سے بچ کے چچا ظفر خان کے گھر کا چکر ضرور لگاتے - عمر خان اپنے بیٹے کی اس حرکت سے ناواقف نہیں تھے مگر انجان بن بیٹھے تھے - اور چشم پوشی سے کام لیتے تھے - دل ہی دل میں وہ نسیم خان کے اس اقدام کو پسند کرتے تھے اور خواہش یہی تھی کہ کم از کم بچوں کا آنا جانا لگا رہے -

تعلق میں فرق آجائے تو کئی لوگوں کو اس میں کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے - رشتوں میں دراڑیں پڑتے دیکھ کر گاؤں کے نام نہاد رہنما حاسد بن کر معاملے میں کود چکے تھے - ان لوگوں نے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے کی انتہائی کوششیں کر ڈالیں مگر انہیں زیادہ کامیابی نہیں ملی - عمر خان نے تو سرے سے ان لوگوں کو توجہ ہی نہیں دی ہاں البتہ ظفر خان کسی حد تک انہیں ہمدرد سمجھنے لگا - اکلوتی بہن کو بھی دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ہاتھ آیا اور اس نے کوثر کے کان بھرنے شروع کئے ؛ طرح طرح کی غلط فہمیاں اس کے دماغ میں داخل کیں - کوثر کو بتایا گیا کہ عمر خان اور نسیم دونوں فیصلہ کر چکے ہیں کہ اگر زمین ان کے ہاتھوں سے نکلی تو وہ اس رشتے کو سرے سے ختم ہی کر دیں گے - عمر خان سے مایوس ہونے کے بعد نسیم خان کو بھی جھوٹی خبر پہنچا دی گئی کہ فیصلہ آنے کے بعد کوثر رشتے سے انکار کر دے گی، یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے -

پھوپی جان اور گاؤں کے حاسدین کے گھناؤنے کھیل کے بعد نسیم خان نے تو چپ سادھ لی تھی مگر کوثر نے بڑے فیصلے کے لئے خود کو تیار کر لیا تھا - فریقین میں سے کسی کی ہار یا جیت کی صورت میں وہ فوراً" اپنا فیصلہ سنا دے گی - اسے کسی کی ہار یا جیت سے کوئی غرض نہیں تھی ؛ اس کے سامنے خاندان اور اس کی عزت ہر شے سے بڑھ کر تھی - اگر اسے اپنا رشتہ زمین سے وابستہ اور مشروط کرنے کا شائبہ بھی ہوا تو اس صورت میں اس کا اپنا فیصلہ ہی لاگو ہوگا اور وہ فیصلہ ہر فریق کے لئے حیران کن ثابت ہوگا - نسیم خان اور کوثر دو مہینے سے ایک دوسرے سے نہیں مل پائے تھے اس لئے کسی کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ دوسری جانب کیا ہو رہا ہے -

گاؤں کے بڑے حجرے میں مقدمے کی کاروائی جاری تھی - گاؤں اور آس پاس کے علاقے سے علماء اور معززین شریک تھے - اور ان کو ایک مبنی بر انصاف متفقہ فیصلے تک پہنچنا تھا - عمر خان اس کا بیٹا نسیم خان اور ظفر خان حجرے میں موجود تھے اور ان کے روبرو مقدمے کی کاروائی ہو رہی تھی - نسیم خان کے لئے اپنا رشتہ بچانے کا یہ آخری موقع تھا اور ظفر خان ہی وہ واحد شخص تھا جہاں سے کوشش کر کے وہ اپنی بات منوا سکتے تھے چنانچہ رات دیر تک نسیم خان، ظفر خان کو منانے کی کوششوں میں لگے رہے اور نتیجہ اب کچھ ہی لمحوں میں برآمد ہونے والا تھا -

جرگے کے بزرگ مولانا ادریس فریقین سے مخاطب تھے، "عمر خان اور ظفر خان، ہم لوگ یہاں اس معاملے کا تصفیہ کرنے جمع ہوئے ہیں جو آپ

دونوں بھائیوں کے درمیان وجہ نزاع بنی ہوئی ہے- آپ دونوں کی نیک دلی اور حد درجہ شرافت میں کوئی کلام نہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہمارا ہر فیصلہ آپ دونوں کو بسر وچشم قبول ہوگا - ہماری کوشش ہوگی کہ شریعت اور پختون روایات کے مطابق انصاف پر مبنی فیصلہ کرلیں"- جرگہ اپنی طرف سے کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے آپ دونوں فریقوں کو بھی سنے گا تبھی ہم کسی مناسب فیصلے تک پہنچ سکیں گے چنانچہ ہم پہلے عمر خان کو سنیں گے اور اس کی رائے جانیں گے،، ہاں تو بھائی عمر خان!! تم کیا کہتے ہو اس بارے میں....؟ "

فکرمندی کے باوجود عمر خان کے چال اور گفتگو میں اعتماد تھا،"معززین! اصل معاملہ آپ کے علم میں آچکا ہے- بچی کھچی ڈھائی کنال زمین کا تنازعہ ہم دو بھائیوں کے لئے آزمائش بنا ہوا ہے- اصل حقدار کا فیصلہ کرتے ہوئے آپ کو زمینی حقائق کو بھی دیکھنا ہوگا - ہر کوئی شاھد ہے کہ میں نے اپنے بہن بھائی اور خاندان کی بھلائی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا ہے- ان کے بہتر مستقبل اور تعلیم کے لئے میں نے اپنی خوشیاں قربان کیں- خود اپنی تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر میں نے ان کو تعلیم کی تکمیل کا موقعہ فراہم کیا- میں خود بھوکا رہا مگر ان کو کھلایا - ان کی ایک ایک درد اور تکلیف پہ میں رات رات بھر جاگتا اور تڑپتا رہا ہوں- میں نے کبھی ان کی کوئی خواہش رد نہیں کی - جس چیز پر ان لوگوں نے ہاتھ رکھا میں نے بغیر کسی حیل وحجت کے ان کے حوالے کردی- اب جبکہ یہ اپنے اپنے کنبے کے سربراہ اور کفیل بن چکے تو مجھ سے اس زمین کا مطالبہ کررہے جو میرے پاس میرے مرحوم بابا کی آخری نشانی ہے- حق وناحق کا فیصلہ بعد میں کریں پہلے یہ طے کرلیں کہ باپ بن کر ان کی پرورش کے بعد کیا یہ مجھ سے اس مطالبے کا حق رکھتے ہیں؟؟"-

سارے مجمعے کو گویا سانپ سونگھ گیا ہو؛ ہر کوئی خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا- اپنی بھیگی آنکھوں کے گوشے نمی سے صاف کرکے عمر خان آگے بولا

"ڈھائی کنال کا یہ چھوٹا سا کھیت میری کل کائنات ہے میری زندگی ہے؛ بابا کی انگلی پکڑ کیاس کھیت کے اترتے چڑھتے پگڈنڈیوں پہ میں بہت بھاگا دوڑا ہوں- اس کھیت کے ساتھ میرا تعلق برسوں پرانا ہے - میرے بھائی ظفر خان اور گاوں کے معززین بھی میرے اس دلی تعلق سے واقف ہیں- آپ لوگ جو بھی فیصلہ سنائیں گے وہ اپنی جگہ، مگر مجھے اس زمین سے الگ کرنا میرے نزدیک زیادتی ہوگی- میں کوشش کرکے بھی اس کھیت کے ساتھ تعلق کو ترک نہیں کرپاوں گا- اپنے مرحوم بابا کی نشانی مجھ سے نہ چھینیں- باقی جو کچھ آپ کہیں میں دینے کو تیار ہوں- مجھے اور کچھ نہیں کہنا"-

جرگے کے بزرگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر کچھ بولے نہیں- اب ظفر خان کی باری تھی- اسے اپنا مطالبہ جرگے کے سامنے رکھنا تھا چنانچہ اجازت ملتے ہی وہ یوں گویا ہوا-

" معززین آپ کی آمد کا مشکور ہوں اور امید واثق رکھتا ہوں کہ دو بھائیوں کے درمیان یہ تنازعہ آپ لوگوں کی مدد سے بہترین طریقے سے حل ہو جائے گا- میں نے مقدمہ آپ لوگوں کے سامنے رکھ دیا ہے - بڑے بھائی کے احسانات اور خدمات ہمارے لئے ایک مقدس بوجھ ہیں اور ہم چاہ کر اس کا بدلہ نہیں اتار سکتے - بھائی جس قطعہ زمین کو مقدس اور بابا کی نشانی قرار دے رہے ہیں وہ ہمارے لئے بھی بالکل انہی کی طرح قیمتی اور والد محترم کی نشانی ہے- شرع کے مطابق بھی اس میں ہمارا برابر کا حصہ بنتا ہے - میں نے تنہائی میں اس معاملے پر بہت سوچا مگر اس مقدس نشانی سے دستبردار ہونے کے لئے خود کو آمادہ نہ کرسکا اور یوں تلخیاں بڑھنے سے روکنے کے لئے مجھے آپ لوگوں کو درمیان میں لانا پڑا- اب آپ لوگ جو بھی فیصلہ دیں گے مجھے منظور ہوگا"- اتنا کہہ کے ظفر خان بیٹھ گئے-

جرگے کے ارکان کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے؛ آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال جواب ہوتے رہے- خاندان کی کل زمین اور اس میں سے تینوں بہن بھائیوں کو ملنے والے حصے کی تفصیلات انہوں نے معلوم کرلی تھیں اور سارے تفصیلات کا علم انہیں ہو چکا تھا- فیصلہ کرنا اب اتنا مشکل نہیں تھا بلکہ ہر کوئی جانتا تھا کہ ممکنہ فیصلہ کیا ہوسکتا ہے- سب کچھ واضح تھا؛ بات صرف جذباتی وابستگی پر اٹکی ہوئی تھی -مولانا ادریس فیصلہ سنانے آٹھ کھڑے ہوئے اور بولے،" ہم نے فریقین کا موقف جان لیا ہے- یہ معاملہ مالی نہیں بلکہ اس سے زیادہ جذباتی ہے اور شرع میں جذبات سے زیادہ وراثت کے قوانین پر عمل ضروری ہوتا ہے چنانچہ ہم متفقہ طور پر ظفر خان کو کھیت میں برابر کا حصہ دار سمجھتے ہیں- چنانچہ بہن کا حصہ نکالنے کے بعد باقی کھیت دو حصوں ....!!!

"رک جائیں مولوی صاحب.....!!! ظفر خان اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے- " قطع کلامی کی بے حد معذرت، مگر میری بات سن لیں؛ مجھے اس مقدمے میں کسی کی ہار یا جیت منظور نہیں؛ میں آپ کے فیصلے تک پہنچ چکا ہوں - مجھے انصاف مل

چکا؛ اب میرا فیصلہ سن لیں"۔

حجرے میں موجود جرگے کے ارکان حیرت زدہ ہوکر ظفر خان کو دیکھ رہے تھے

" زمین کے ساتھ اپنے بھائی کی شدید جذباتی وابستگی دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس زمین پر ان کا قبضہ بجا ہے۔ میں کبھی بھی اس زمین کو وہ مقام نہیں دے پاؤں گا جو میرے بھائی دے رہے ہیں۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے، اس لئے میں جرگے کے سامنے اپنے بھائی کے حق میں اس زمین سے دستبرداری کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ زمین آج کے بعد ان ہی کی ملکیت ہوگی"۔

عمر خان جواب تک سر جھکائے افسردہ سے بیٹھے تھے ظفر خان کے اس غیر متوقع اعلان پہ چونک اٹھے۔ مجمعے سے داد و تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں۔ تمام لوگ ظفر خان کو تعریفی نظروں سے دیکھنے لگے جو اس وقت واپس اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے۔ اب حیران کر دینے کی باری عمر خان کی تھی اور اس نے اس دوران دل ہی دل میں خود کو ایک بڑے فیصلے کے لئے تیار کر لیا تھا۔

عمر خان آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھے، گلا صاف کرنے کے بعد جرگے کو مخاطب کر کے پرسکون لہجے میں مدھم آواز میں بولنے لگے،

" بہت شکریہ معززین اور بہت شکریہ بھائی ظفر خان! آج مجھ کو احساس ہو گیا کہ کتنے چاہنے والے اور بہی خواہ میرے ارد گرد موجود ہیں۔ آج اگر میرا سینہ خوشیوں سے بھرا ہوا ہے تو سر فخر سے بلند بھی ہے۔ آج سے زیادہ اطمینان بھرا دن میری زندگی میں شائد پہلے کبھی نہیں آیا ہوگا۔ سو اس موقع کو یادگار بناتے ہوئے میں بھی ایک اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ ڈھائی کنال کی یہ زمین جس پر ہم جھگڑ رہے تھے اور جس کی دعوے داری نے ہمارے خونی رشتوں کو نقصان پہنچایا اور جواب میرا حصہ قرار دی جا چکی ہے، اس زمین کے بہترین مصرف کے لئے میرے دل میں ایک منصوبہ جنم لے چکا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ بہن کو اس کے حصے کی نقد ادائیگی کے بعد ہم اس زمین پر گاوں کے لئے ایک بڑی اور شاندار مسجد بنائیں گے اور مسجد کا نام اپنے مرحوم بابا کے نام پہ یعقوب خان مسجد رکھیں گے۔ موجودہ مسجد ہمارے گاوں کی بڑھتی ضروریات کے لئے ناکافی ہے۔ بھائی ظفر خان اس منصوبے میں میرے دست راست، پورا گاوں معاون اور اللہ میرا مددگار ہوگا"۔

مجمعے میں سے داد و تحسین، مبارکباد اور اللہ اکبر کی فلک شگاف صدائیں بلند ہوئیں۔ ظفر خان نے دوڑ کر بھائی کو گلے لگا لیا۔ باپ کے پاس بیٹھے نسیم خان کا چہرہ بھی خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ تصور ہی تصور میں کوثر کے مرمریں چہرے پر حیا کی سرخی پھیلتے دیکھ رہا تھا۔ جرگے کے سارے اراکین عمر خان کے ارد گرد جمع ہو کر اسے شاباش دے رہے تھے۔ ٹپ ٹپ گرتے آنسو عمر خان کے رخساروں کو دھو رہے تھے؛ مگر یہ تو خوشی کے آنسو تھے.....!!!

فیصلے کے انتظار میں بیٹھی کوثر کو نسیم خان کا مختصر پیغام فورا" ہی مل گیا، " بیگم کوثر نسیم! ہم سب نے مل کر جنت تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؛ کیا تم اس میں اپنا حصہ ڈالنے کے لئے آگے نہیں بڑھو گی"۔

اور کوثر کو اپنا ترتیب دیا ہوا فیصلہ تیز لہروں میں بہتا نظر آیا؛ دور سے دور نکل کر نظروں سے غائب ہوتا ہوا اور وہ اپنی ماں کے گلے میں جھول کر بے تحاشا رونے لگی۔

لبنیٰ صفدر/ لاہور

قائداعظمؒ

برسوں کی گھٹن ختم ہوئی تیری بدولت
آزاد فضا ہم کو ملی تیری بدولت
تاریکی کے جنگل سے نکالا ہمیں تو نے
دیکھی ہے یہاں صبح نئی تیری بدولت
زنجیر غلامی کے ترے ہاتھ سے ٹوٹی
دیوار جو تھی در وہ بنی تیری بدولت
ہر خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا ہے
ہر آنکھ میں خوشیوں سے نمی تیری بدولت
گمنام ہی رہنا تھا یہاں میں نے وگرنہ
پہچان ہے دنیا میں مری تیری بدولت
پھونکی ہے نئی روح تن مردہ میں تو نے
یہ سوئی ہوئی قوم اُٹھی تیری بدولت
لبنیٰ نے ترا نام لکھا دل کی گلی میں
اے قائداعظم یہ سجی تیری بدولت

قائد کے نام

یہ دیس عنایت ہے تری قائداعظم
حاصل ہمیں بابت ہے تری قائداعظم
ہونٹوں پہ ترا ذکر ہے دل میں ہے تری یاد
اور آنکھوں میں صورت ہے تری قائداعظم
ہیں قابل تقلید عمل سارے ہی تیرے
بے مثل ہی سیرت ہے تری قائداعظم
جس دیس میں رہتے ہیں فقط دیس نہیں ہے
بخشی ہوئی جنت ہے تری قائداعظم
لہرایا ہے اسلام کا پرچم یہاں تو نے
یہ دیں سے محبت ہے تری قائداعظم
حاصل یہ وطن کر کے دکھایا تن تنہا
ہمت ہے یہ جرات ہے تری قائداعظم
لبنیٰ کو کسی اور میں دِکھتی ہی نہیں ہے
جو شان جو شوکت ہے تری قائداعظم

انجانا خوف

عاصم بخاری/میانوالی

کرونا وبا کا طوفان ابھی پوری طرح تھما نہ تھا۔اس کی بھیانک تصاویر اور قرنطینہ کی قید تنہائی کے اذیت ناک مناظر اور تکلیف دہ موت میت کا پلاسٹک کوروں میں لپیٹا جانا کسی اپنے پرائے کا میت کے نزدیک نہ جاسکنا بے بس ہو کے دور سے تکنا میت کو رسیوں سے باندھ کر حفاظتی انتظامات کے ساتھ دور سے سپردِ خاک کرنا کے لمحات ذہن سے محو نہیں ہوئے تھے کہ ویکسینیشن کی تحریک بہت زور پکڑ گئی۔ بقول منیر نیازی

پھر ایک دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
جب ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

ویکسین کی بات کیا چلی کہ دنیا بھر میں اس کے حق میں کم اور مخالفت میں زیادہ پروپیگنڈا شروع ہو گیا کہ ویکسین لگوانے کے بعد آدمی دو سال کے اندر مر جاتا ہے۔فلاں نے ویکسین کی پہلی خوراک لگوائی اور دوسری خوراک لگوانے کی نوبت ہی نہیں آئی پہلے اللہ کو پیارا ہو گیا۔فلاں ویکسین لگوانے سے خون گاڑھا ہو جاتا ہے اور موت واقع ہو جاتی ہے۔اس ویکسین کے لگنے سے مردانہ قوت جاتی رہتی ہے۔فلاں ویکسین لگنے سے عورت بچے پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔وغیرہ وغیرہ۔الغرض جس نے بھی بات کی موت کی ہی کی زندگی کسی نے کم ہی اسے کہا۔

حکومتی اقدامات ویکسین لگوانے کے حوالے سے سخت سے سخت تر ہونے لگے۔ویکسینیشن کے بغیر ایک قدم چلنا اور لین دین معاملاتِ زندگی ناممکن نظر آنے لگے۔حکومتی عمل درآمد کی دھمکیوں کا سلسلہ بڑھنے لگا۔

"بزدل" بھی اس ساری صورتِ حال سے پریشان تو پہلے سے ہی تھا اب حیران ہونے لگا۔جہاں بھی ویکسین کا ذکر چھڑتا وہ وہاں سے چل دیتا۔مگر اب پتا چلا کہ اب تم ویکسین لگوائے بغیر گھر سے باہر ایک قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔نہ پٹرول ملے گا نہ گاڑی میں سفر کر سکو گے نہ دکان دار سودا دے گا نہ ڈاکٹر علاج کرے گا اور نہ سکول کالج یونی ورسٹی میں اس کے بغیر داخلہ اور سنا ہے گھر گھر ویکسینیشن کی سکیم بھی جلد شروع ہونے والی ہے۔المختصر ان باتوں نے بزدل کی نیندیں حرام کر دیں۔وہم کا مریض ہو گیا۔حکومتی سختی کے باعث بزدل" کے سارے خاندان (چھوٹوں، بڑوں) نے ویکسین لگوالی مگر "بزدل" کا معاملہ جوں کا توں رہا۔

علاقہ کے تھانیدار کے پاس ویکسین نہ لگوانے والوں کی فہرستیں پہنچ گئیں جن میں بزدل کا نام سرِ فہرست تھا خاندان سارا پریشان تھانے دار کی طرف سے فون پر فون اور پیغام آ رہے ہیں۔خاندان کے دانا سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔تدبیریں کرنے لگے کہ آخر اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔کیوں کہ بزدل ویکسین کا نام بھی سننے کو تیار نہ تھا۔کافی سوچ بچار کے بعد خاندان اور برادری کی اسی بات پر دعائے خیر ہوئی بیرونی دباؤ زیادہ ہے "ہر چہ باداباد" بزدل کی ویکسین ناگزیر ہے۔جب کہ ویکسین کا نام سنتے ہی بزدل کی روح پرواز کرنے لگتی ہے۔بہر حال بزدل کو مذاکرات پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔کہ ویکسین کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔خدا کو یاد کر کے کمر ہمت باندھو کچھ نہیں ہوتا۔

بزدل۔ کچھ کیسے نہیں ہوتا۔قبرستان بھرے پڑے ہیں۔فیس بک تو کھول کے دیکھو۔چلو ٹھیک ہے ویکسین نہیں میں موت کو گلے لگاتا ہوں مگر۔۔۔

خاندان۔ مگر کیا

بزدل۔میری چند شرائط ہیں

خاندان۔۔۔شرائط۔۔۔۔!کون سی

بزدل۔ موت تو آ ہی گئی ہے۔پھانسی اور سزائے موت والے کی آخری شرائط سوائے سزائے موت کے مانی جاتی ہیں۔یہ کوئی نئی بات نہیں۔

خاندان۔ہاں ہاں جلدی بولو،کیا شرائط ہیں

بزدل۔۔۔میں اب بچتا تو نہیں

بقول شاعر:

"رب تے سجناں دی بکا مرضی ہو گئی اے"

ویکسین میرے نزدیک موت کے ٹیکے کا دوسرا نام ہے۔

خاندان۔۔۔جذباتی ہو کر۔۔۔تو پھر کچھ بولو نا!

بزدل۔۔۔کانپتے ہونٹوں سے۔۔۔۔

ہو سکے تو میری شادی کر دو۔ہو سکتا ہے میرا نام مٹنے سے بچ جائے کوئی نشانی تو بعد میں رہ جائے

خاندان۔۔۔لو جی۔۔۔کھودا پہاڑ اور۔۔۔

ہو جائے گی،ہو جائے گی۔۔۔قبول ہے شرط

بزدل۔۔۔جب ویکسین لگوانے جائیں سارا

خاندان بارات اور جنازے کی شکل میں میرے ساتھ ہو

خاندان۔۔۔مان لیا

بزدل۔۔۔انتہائی خوف زدگی کے عالم میں زیرلب کچھ پڑھتے ہوئے۔۔۔۔

خاندان۔۔۔شرائط پوری کرنے کے بعد حسبِ وعدہ ایک جلوس کی شکل میں ہسپتال کی راہ لیتا ہے۔ ہسپتال کا عملہ دیکھ کر حیران پریشان ہوتا ہے یا اللہ خیر

استفسار پر پتا چلا کہ بزدل کو کرونا ویکسین کرانے کے لیے لایا جارہا ہے۔

نرس۔۔۔ڈیٹا کا اندراج کرتی ہے

بزدل کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگتی ہے۔ٹھنڈا پسینہ شروع ہونے لگتا ہے۔چہرے پر موت کی زردی چھانے لگتی ہے باپ بڑھ کر سینے لگاتا ہے حوصلہ دیتا ہے میرے نورِ نظر، میرے لختِ جگر یہ سارا خاندان تمہارے ساتھ کھڑا ہے۔کیا پڑھ رہے ہو

بزدل۔۔۔ان للہ

باپ۔۔۔بے شک بیٹا کل نفسٍ ذائقہ الموت مگر

بزدل۔۔۔حسرت بھری نگاہوں سے مگر کیا۔۔۔اب موت کے پھٹے پہ تو چڑھا دیا۔خوش رہو۔شاید تمہیں تھانیدار کچھ نہ کہے

نرس۔۔۔سرنج لے کر بزدل کی طرف بڑھتی ہے۔خوف سے صرف بزدل ہی نہیں اس کی ساری کرسی بھی کانپے جارہی ہے۔

بزدل۔۔۔ایک سیکنڈ صبر کرو ،انجکشن نہ لگانا۔میں اپنے پیارے باپ سے آخری بار گلے مل لوں

نرس۔۔۔جی بالکل مل لیں۔

نرس۔۔اب اجازت ہے انجکشن لگاؤں؟

بزدل۔۔۔ٹھہر تجھے کیا جلدی ہے۔مجھے کلمہ شہادت تو پڑھ لینے دے

نرس۔۔۔جی جی۔۔۔بے شک

پڑھ لیا۔۔۔؟

بزدل۔۔۔ٹھہر مجھے آنکھیں تو بند کر لینے دے۔مجھے اپنا رخ تو کعبہ ول کر لینے دے۔اب پڑھ بسم اللہ

نرس۔۔جی او کے بس ہوگئی ویکسین

بزدل۔۔۔ہوگئی !اچھا پتا بھی نہیں چلا خوشی سے چھلانگیں لگاتا ہوا خاندان کو ہسپتال چھوڑ کر گھر پہنچ گیا۔ہوا کچھ بھی نہیں

ہائے رے انجانا خوف

✦✦✦

افسانہ

پرورش

نعمان حیدر حامی

''ارے! ارے! آپ نے میری کون سی پرورش کی ہے؟ قندیلہ نے ماں کے سامنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا"۔

قندیلہ کی امی کہنے لگی "بتاتی ہوں۔بتاتی ہوں۔ آج اپنے ابو کو آنے دیں۔ میں تمہاری وہ پٹائی کرواؤں گی کہ تم مرتے دم تک یاد کرو گی۔"

قندیلہ نے کہا" ہاں! ہاں چغلی کھا کر مجھے ابو سے مار دلوائیں گی۔ ہائے اللہ! ماں ہیں یا سوتن۔" ابھی یہی باتیں ہورہی تھیں کہ اتنے میں قندیلہ کے ابو عاصم صاحب بھی دفتر سے گھر لوٹ آئے۔"ایک کپ چائے کا مل سکتا ہے" عاصم صاحب نے چارپائی پر لیٹ کر ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔" آپ تو چینی والی چائے مانگتے ہیں میں آپکو بغیر چینی والی چائے بھی نہ دوں پہلے اپنی اولاد کو تو اپنی غیرت والی چائے پلا دو۔" قندیلہ کی امی نے باورچی خانے سے کہا۔

"بیٹی پھر کونسا سقوط ڈھاکہ ہوگیا" عاصم صاحب نے قندیلہ سے پوچھا قندیلہ کے منہ پر پہلے ہی بارہ بجے ہوئے تھے وہ خاموش رہی۔

"ہاں! ہاں! یہ کیوں بتائے گی میں بتاتی ہوں ساری کہانی" اس کی امی نے سالن میں نمک ڈالتے ہوئے کہا۔

عاصم صاحب کو ایسے لگ رہا تھا جیسے آج کہانی سن کر میری چائے کی خواہش پوری ہوجائے گی۔

" پتہ نہیں کہاں سے اللہ میاں نے ہمارے گھر میں یہ بلا پیدا کر دی؟ اسکو پالا پوسہ صبح سے سوال کر رہی ہے آپ نے میری کونسی پرورش کی؟ مجھے تو لگتا ہے یہ زمانے کے سارے گُر میرے پیٹ میں ہی سیکھ کر آئی ہے" اس کی امی نے کہا۔

عاصم صاحب تو اپنی شریک حیات کی نہ ختم ہونے والی کہانی سن کر پہلے تو چائے کا انتظار کرتے رہے لیکن یہ انتظار ندارد ہی رہ گیا.

" اچھا اچھا کوئی بات نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ماشاءاللہ میری بیٹی بہت بھولی بھالی ہے " عاصم صاحب نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

ابو کا ووٹ اپنے پلڑے میں دیکھ کر قندیلہ خوشی سے ناچنے لگی "ابو ابو میں چائے بنا دوں؟

" نہیں نہیں بیٹی" عاصم صاحب نے قندیلہ کے

سر پر ہاتھ کر کہا۔

" آپکی امی کی کہانی نے چائے تو چائے اگلی صبح کا ناشتہ بھی کروادیا ہے"۔

" لگتا ہے آپ بھی بچپن میں اپنے امی ابو سے یہی سوال کر چکے ہیں؟ کہ میری آپ نے کونسی پرورش کی ہے؟"۔

قندیلہ کی امی نے عاصم صاحب کو طنزیہ انداز میں کہا.

"اچھا اچھا اب باہر بھی جانے دو کہیں ہوٹل والی چائے بھی بھول نہ جاؤں؟؟؟" عاصم صاحب نے اپنی چھتری اٹھائی اور ہوٹل کی جانب چل دیے۔

راستے میں جاتے ہوئے انہیں اسلم مل گیا۔ جو کسی زمانے میں عاصم کے ساتھ پڑھتا تھا اور دونوں میں خوب دوستی تھی.

" آؤ! آؤ! جناب عاصم بھائی کہاں گم ہو یار آج کل تو عید کا چاند ہو گئے ہو"۔

بس بھیا!! کیا پوچھتے ہو؟ ہر طرف صف ماتم ہے۔

" کیوں! کیوں! بھائی کیا ہوا ہے سب خیریت تو ہے نا"۔

عاصم صاحب کہنے لگا" دفتر سے چھٹی ہوئی گھر آیا بیگم سے چائے مانگی تو ہائے ہائے اس نے چائے تو کیا قہوے کے ساتھ بسکٹ دینا بھی گوارہ نہیں کیا۔ سوچا ہوٹل پر چلا جاؤں چائے بھی مل جائے گی اور کسی دوست سے گپ شپ بھی کرلوں گا۔"

اسلم کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا" بھائی عاصم زندگی میں پہلی بار آپ کے منہ پر بارہ بجتے دیکھے ہیں ضرور کوئی گڑبڑ ہے"۔

عاصم صاحب کی آنکھوں سے درد بھرے آنسوؤں کی لڑیاں بن کر جھولی میں بکھرنے لگیں۔

اسلم جی! زمانہ بھی عجیب آ گیا ہے۔ میری بیگم اور بیٹی کا صبح سے پرورش کے موضوع پر خدا جانے کیا جھگڑا ہے۔ بیٹی ماں سے کہتی ہے کہ تم نے کونسی میری پرورش کی ہے؟؟۔ مجھے تو آج تک کسی نے کچھ نہیں سکھایا۔ اولاد کا یہ حال ہے۔ ماں باپ کی باتیں سننا گناہ سمجھتے ہیں۔" عاصم صاحب نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

اسلم کہنے لگا

"چلو گھر چلتے ہیں میں بیٹی کو سمجھاؤں گا۔ چلو پھر چلتے ہیں۔'

عاصم بیچارے کے ہاتھوں میں تو طاقت بھی نہ رہی اسلم نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے قندیلہ نے آواز دی

" کون؟"

"بیٹا میں اسلم ہوں۔"اسلم نے کہا۔

قندیلہ نے اندر سے ہی آواز لگاء"جی۔۔۔جی انکل جی۔۔۔آیئے۔۔۔آیئے"

اسلم نے قندیلہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور صحن میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

عاصم صاحب دل ہی دل میں شرمندگی کے مارے گھر سے باہر منہ چھپا کر کھڑے ہو گئے تھے کہ میرے ہوتے میری اولاد کو دوسرے سمجھائیں۔ میرے لیے تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

عاصم بھائی! کہاں رہ گئے؟ اسلم نے دروازے پر آ کر دیکھا تو عاصم صاحب دروازے پر کھڑے رو رہے تھے.

اسلم نے بھاری آواز میں کہا"ارے! اس میں رونے والی کیا بات ہے؟ آئیں۔۔۔آئیں۔۔۔اندر تو آئیں۔"

قندیلہ نے اسلم کی باتیں سنیں تو بھاگتی ہوئی دروازے پر آئی۔

"بابا جان!! بابا جان!! کیا ہوا؟"

"بیٹا! آج میں تمہیں باپ کے ہوتے ہوئے یتیم محسوس کر رہا ہوں۔" عاصم صاحب نے قندیلہ کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

بیٹا جب باپ کے ہوتے ہوئے دوسرے اولاد کو پرورش جیسے لفظ کے معنی ومفہوم سمجھائیں تو باپ جیتے جی مر جاتا ہے۔ اسلم انکل آج آپ کو پرورش کے معنی ومفہوم سمجھانے آئے ہیں۔

نہیں! نہیں! بابا جان میں آئندہ کچھ نہیں کروں گی۔ آپ کا ہر حکم بجالاؤں گی۔ بابا جان! مجھے معاف کردیں۔

قندیلہ دروازے پر عاصم صاحب کے سامنے ہاتھ بندھے کھڑی تھی تو اسلم اور قندیلہ کی امی بھی باہر آ گء۔ عاصم اور ان کی بیوی نے قندیلہ بیٹی کو گلے لگا لیا اور ڈھیر سارا پیار کیا ساتھ ہی ساتھ دعا بھی دی۔

قندیلہ دل ہی دل میں بہت شرمسار تھی. اس نے پکا عہد کرلیا تھا کہ آئندہ امی ابو کی ہر بات مانے گی ضد نہیں کرے گی اور نہ ان سے فضول سوالات پر بحث کرے گی۔

Alone

نوین روما/لاہور

میری آنکھ موبائل کے آلارم کے چیخنے پر کھلی میں خلاف عادت بہت زیادہ ہڑ بڑا کر اُٹھی اور آلارم آف کیا، لیٹے لیٹے میسج دیکھے لیکن موبائل اس بارے میں بالکل خاموش تھا آج تو کسی موبائل کمپنی نے بھی مجھے میسج نہیں کیا تھا۔ واش روم گئی دانت برش کرنے کے لیے جیسے ہی میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو ٹوتھ برش کے ہولڈر میں مجھے اپنا برش تنہا تنہا نظر آیا۔ کچھ سال پہلے کی یاد آئی جب میرے برش ہولڈر میں میرا برش تنہا نظر آتا ہے پھر اس کا ساتھ دینے ایک اور قدرے بڑا اور خوبصورت برش آ گیا۔ لیکن آج پھر یہ منظر اکیلا ہو گیا تھا میرا ٹوتھ برش اپنے ہولڈر کے ساتھ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی سپیس شپ کسی بے آباد سیارے میں تنہا رہ گیا ہوا۔ گھر سے گئے آج ایک مہینہ ہونے کو تھا۔ جاتے ہوئے وہ اپنی ہر چیز لے گیا۔ یہاں تک کے واش روم میں پڑا وہ اپنا ٹوتھ برش اپنے شیمپو، کنڈیشنر اپنے ساتھ لے گیا، کمرے میں موجود ہر وہ چیز جو اسکی ذات کے ساتھ منسلک تھی جیسے کہ اس کا تولیہ، ہاتھ کی انگوٹھیاں، دوائیاں، کتابیں، کاغذات کپڑے سب کچھ۔ بیڈ کی وہ سائیڈ جہاں وہ سوتا تھا بالکل یوں تھی جیسے کرائے دار عجلت میں اپنا ساز و سامان اُٹھا کر لے جائے۔ ٹوتھ برش کو واپس رکھتے ہوئے مجھے تنہائی اور اکیلے پن کا احساس ہر صبح ہوتا تھا، کمرے میں واپس آ کر ہر روز ایسا ہی محسوس کرتی جیسے یہاں سے کسی نے ہجرت کر لی ہے جب کوئی انسان ہمارے زندگی سے نکلتا ہے تو جسمانی حثیت کے ساتھ ساتھ اس کی روح بھی چلی جاتی ہے اور دُعا ہے اُس کا نام میں نے ایسے کمپیوٹرائزڈ طریقے سے ڈیلیٹ کیا کہ کبھی زبان پر بھی نہیں آ رہا تھا۔ میرا بیٹا بیڈ پر تنہا سو رہا تھا اُس نے اپنی ٹانگیں اپنے باپ کی جگہ پر رکھی تھی گویا وہ اس کی جگہ لینے کی کوشش کر رہا تھا صبح دفتر سے نکلنے سے پہلے تو اب کوئی مجھے کہنے والا تھا کہ پلیز مجھے بھی جاتے دیتی جانا۔ اس لیے آپ دفتر جانے سے پیش تر مجھے کوئی خاص کام نہیں ہوتا تھا۔ نہ ناشتہ، نہ کپڑے تیار کرنا، نہ واش روم میں کچھ رکھنا سارے معاملات مختصر ہو گئے تھے لیکن دوسری طرف یوں لگ رہا تھا کہ دُنیا کے اِس بھرے بورے میلے میں کسی نے مجھے یک لخت دھکا دے کر داخل کر دیا ہو، جہاں ہر طرف لوگ ہی لوگ ہیں انجان لوگ انجانی شکل، نہ تو مجھے راستہ کا پتہ اور نہ کہ کوئی آشنا صورت اس میلے میں نظر آ رہی ہے سر پر ایکدم سے تیز دھوپ آ کھڑی ہو۔ بل کون جمع کرائے گا۔ گاڑی کا کام کروانا ہے، مستری کی ورکشاپ پر گاڑی کی سروس کروانی ہے۔ لمبی لائن ہے ماموں کے بیٹے کی شادی آ رہی ہے، فوٹو شوٹ میں کیا ہو گا، بچوں کے سوالوں کے جواب نا قابل تسلی دینے پڑتے ہیں، کیا میرا بڑھاپا بھی ماں جیسا تنہا اور طویل ہو گا۔ راستے بھر یہی سوال نظر آئے کبھی بھکاری یہ سوال مجھ سے کر رہے ہوتے کبھی ٹریفک کی سگنل لائٹس مجھ سے یہ پوچھتیں، آج کا دن میرے لیے بڑا اہم ہے آج میرے بیٹے کی سالگرہ ہے میرا بیٹا میرا روشن ستارہ۔ کتنی دُعاؤں سے ہوا اور اسکی پیدائش سے پہلے ہی اس کا نام سوچ لیا تھا کتنے پلانز تھے ہمارے آج کے دن کو لے کر۔۔ لیکن جس طرح سے حکومتیں گر جاتی ہیں تاج و تخت لمحوں میں تہس نہس ہو جاتے ہیں ایسے یہ ایک رات آ گئی اور میری زندگی میں ہمیشہ کے لیے مارشل لاء کا نفاذ ہو گیا۔ یہ دن میرے لیے خوشیوں سے بھرا ہونا تھا اتنا کٹھن اور دشوار کیسے ہو گیا۔ بیٹے کی سالگرہ پر اکیلے میں رشتے داروں، دُنیا والوں کو کیا منہ دیکھاؤں گی؟ ان کے سوالوں کے جواب کیا ہوں گے اور کیسے میں ان سب باتوں کا سامنا کر پاؤں گی؟۔ اتنی طاقت کہاں ہے میرے دل میں، دفتر میں سارا دن یہی سوچنے مین گزرا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ سب کچھ تیار ہے مہمان آ رہے ہیں، سب تیار ہو رہے ہیں کھانوں کی خوشبو ہر طرف پھیل رہی ہے اور میں شاور کے بہانے واش روم سے نکل ہی نہیں رہی، ایک ڈر ہے بس جو میرے ساتھ ہے میرے پاؤں ٹھنڈے ہوتے جا رہے ہیں، کہیں میری موت تو واقع نہیں ہونے لگی۔ مجھے بچپن میں کسی نے بتایا تھا کہ بیٹا انسان کے پیروں میں ساری طاقت ہوتی ہے جو ہمیں یہاں سے وہاں تک لیے پھرتی ہے، اسی لیے کہتے ہیں نہ کہ سر ٹھنڈا اور پاؤں گرم ہونے چاہیں۔ ساری طاقت انہیں میں ہے اور اس وقت میرے سر پر ٹھنڈے برف جیسے ہوتے جا رہے ہیں، نہیں میں ابھی مرنا نہیں چاہتی لیکن میرا حوصلہ کیسے بڑھے کیا دیکھ کر میں بڑا دل کر سکوں وہ تو اپنی کوئی چیز، کوئی یاد بھی یہاں نہیں چھوڑ کر گیا ایک ایک چیز چن چن کر لے گیا تا کہ مجھے اسکی یاد بھی نہ آ سکے ابھی میں اپنے ٹھنڈے پیروں کو پکڑے بیٹھی تھی کہ واش روم کے دروازے پر چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کسی نے دستک دی،،، ماما آجاؤ، آجاؤ نا۔ میرا روشن ستارہ میرا بیٹا باہر سے مجھے آواز دے رہا ہے میں نے جلدی سے باہر جانا چاہتی ہوں سے بالکل انتظار نہیں کروانا چاہتی۔ چاند کی مانند چمکتا ہوا اپنی روشن آنکھوں سے وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں باہر آنے کے لیے اپنے جوتے تلاش کرنے لگی اتنے میں پتہ نہیں کہاں سے میرے بیٹے نے صوفے کے پیچھے پڑے اپنے باپ کے سلیپرز نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے نہ جانے وہ انہیں لے کر جانا کیسے بھول گیا تھا؟،، میں نے سلیپرز میں پاؤں رکھے تو میرے بیٹے نے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا، ماما، بابا بن گئی، ماما بابا بن گئی۔۔ اس لمحے مجھے اس کے ہونے کی طاقت اپنے اندر منتقل ہوتے ہوئے محسوس ہوئی، مجھے کسی نے بتایا تھا کہ جب ہم مر جاتے ہیں تو جان پیروں سے نکلتی ہے۔ جب ہمارے تعلق کی موت واقع ہوئی تو اس کی جان نکلتے وقت ساری طاقت اس کے پیروں میں رہ گئی اسکے جوتے پہن کر وہ میں نے اپنے اندر منتقل کر لی۔ کیک کاٹتے ہوئے میرے اِردگرد کوئی نہیں تھا اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر میں نے جب چھری سے کیک کاٹا تو تالیوں کے شور اور کیمرے اور موبائل کے فلش لائٹ سے نہ تو مجھے کچھ نظر آیا نہ کچھ سنائی دیا کیونکہ اب میں اس کے حصے کی ساری تھکن اپنے اندر منتقل کر چکی تھی جو میرے پیروں کی طاقت تھی۔

ابن عربی اور ارطغرل

عامر بن علی/ جاپان

ابن عربیؒ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد میں کافی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ اس صوفی درویش نے اپنی مختصر سی زندگی میں آٹھ سو سے زائد کتابیں کیسے لکھ ڈالیں؟ جب اندلس میں ابن عربیؒ نے جنم لیا تو وہاں پر عرب مسلمانوں کی حکومت اپنی طاقت اور استحکام کے عروج پر تھی۔ خدا کے اس ولی نے جو کہ فلسفی، شاعر، محقق اور عالم دین بھی تھا، اپنی زندگی کسی کتب خانے میں نہیں گزاری بلکہ سفر کو وسیلہ ظفر سمجھا۔ حجاز سے لے کر مراکش، حلب اور ایران، عراق سے لے کر ترکی، مصر اور یروشلم تک سفر در سفر تلاش حق، ریاضت اور تبلیغ میں وقت گزارا۔ اس دور میں ذرائع ابلاغ بہت محدود ہوتے تھے اور سفر دشوار گزار تھے، ان کٹھن مسافتوں میں بھی ان کا پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ آج ابنِ عربیؒ سے منسوب ہمارے پاس ساڑھے آٹھ سو کتابیں ہیں جن میں سے سات سو کتب تو مصدقہ ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کتابوں کے نام پر چند صفحات پر مشتمل کتابچے یا پھر رسالے تحریر کیے ہوں۔ تصوف کے موضوع پر ان کی تحریر کردہ ایک کتاب ''الفتوح المکیہ'' کی سینتیس (37) جلدیں ہیں، جن کے مجموعی صفحات کی تعداد پندرہ ہزار ہے۔ ابن عربیؒ جنہیں اہلِ تصوف ''شیخ الاکبر'' کے نام سے پہچانتے ہیں۔ ایک عہد ساز شاعر بھی تھے، ان کے پانچ شعری مجموعے اب تک محفوظ ہیں جنہیں ''دیوان'' کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

دمشق کے ایک مصروف بازار سے ملحقہ تنگ سی گلی مڑتے ہیں تو تھوڑی چڑھائی کے بعد ایک روحانی سلسلے سے منسوب ایک مسجد ہے۔ مسجد کے ایک حجرے میں داخل ہوں تو دس پندرہ فٹ گہرا کمرہ نظر آتا ہے جسے آپ تہہ خانہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کمرے کے درمیان میں سبز رنگ کی چادروں میں لپٹی ابنِ عربیؒ کی قبر کا تعویز نظر آتا ہے۔ سنگ مرمر کا ایک کتبہ صاحب مزار کا تعارف کروانے کے لئے موجود ہے مگر اس حجرے کی معطر فضا اور انوار کی بارش ہی یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ کسی بزرگ ہستی کی اقامت گاہ ہے۔ جیسے جیسے سیڑھیاں اترتے ہیں اور مزار کے قریب پہنچتے ہیں۔ رحمتوں کی رم جھم دل پر گرتی محسوس ہوتی ہے۔ دروازے پر کھڑے درویش اپنی اپنی باری پر صوفیانہ کلام پیش کرتے ہیں۔ ابنِ عربیؒ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صوفی سنی تھے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ سنی اور شیعہ مسلک کے پیروکاروں میں یکساں مقبولیت رکھتے ہیں۔ اس امر کا اندازہ ''قاسیون کی پہاڑی'' کہلانے والی جگہ پر واقع ابن عربیؒ کی تربت پر دیس دیس سے آنے والے زائرین کے حلیے سے باآسانی ہو جاتا ہے۔ اثناء عشری شیعہ حضرات کے نزدیک بارہ اماموں کے اوپر لکھی گئی ابنِ عربیؒ کی کتاب اس موضوع پر معتبر ترین تحریروں میں شامل ہے۔ کتاب کا ذکر آیا ہے تو بتاتا چلوں کہ ''مشکوۃ الانوار'' کے نام سے (101) ایک سو ایک احادیث قدسی کو جمع کر کے شائع کرنا ابن عربیؒ کا ایک منفرد اعزاز ہے۔ مشاہد الاسرار کے نام سے چودہ مکالمے خدائے بزرگ و برتر کے حضور اس ولی اللہ نے تحریر کئے ہیں اور ''حلیات الابدال'' روحانیت کے راستے پر چلنے والوں کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو کسی بھی مسافر کے لئے زادِ راہ کی ہوتی ہے۔

ابنِ رشد سے ہونے والی ملاقاتوں نے ابنِ عربیؒ کی شخصیت پر بہت گہرے اور دور رس اثرات مرتب کئے۔ ان ملاقاتوں کا احوال تاریخ کا اہم حصہ ہے۔ گرچہ یہ ملاقات کروانے میں ابن عربی کے والد کا عمل دخل زیادہ تھا۔ جو کہ خود بھی عالم اور حکومتی عہدیدار تھے۔ ابن رشد مسلم ہسپانیہ میں قاضی کے منصب پر فائز تھے۔ یہاں یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ ابن رشد ان چند مسلمان علماء، فلسفیوں اور ماہرین عمرانیات میں سے ہیں۔ جن سے عالم مغرب بے حد متاثر ہے۔ سابق صدر جارج بش کے نزدیک ابن رشدان کا پسندیدہ مصنف اور ماہر عمرانیات ہے، سابق امریکی صدر نے لکھا ہے کہ وہ ابن رشد کی تحریروں سے بے حد متاثر ہے۔ ابن عربیؒ کے بقول ابن رشد سے پہلی ملاقات میں ہی اس نے سیکھ لیا ہے کہ روایتی تعلیم اور اشیاء کی حقیقت کے درمیان کیا فرق ہے۔ ابن عربیؒ نے اپنے لئے تصوف کا راستہ چن لیا تا کہ اشیاء کی حقیقت کو پا سکے۔

ترکی کے کچھ ٹی وی ڈرامے گزشتہ چند برسوں کے دوران پاکستانی ناظرین میں بے حد مقبول ہوئے ہیں۔ ''میرا سلطان'' ترک ڈراموں کی وطن عزیز میں مقبولیت کا نقطہ آغاز تھا۔ کامیابی کی کئی منزلیں طے کرتے ہوئے آج ہم ایک نئے عہد

میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ پاکستان میں ''ارطغرل غازی'' نامی ترک ٹی وی ڈرامے کی مقبولیت کا عہد ہے۔گرچہ میرے خیال ترکی سے منگوا کر اردو میں ڈھالے گئے ارطغرل کی کامیابی کی بڑی وجہ کرونا وائرس کے سبب لاک ڈاؤن اور بے پناہ عوامی فراغت بھی ہے۔اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ مذکورہ ڈرامے کا معیار انتہائی اعلیٰ ہے۔ان دنوں جب تمام اہل خانہ کے مل بیٹھنے کا بہانہ بنا ہوا ہے تو فیملی میں بیٹھ کر دیکھے جانے کے قابل ٹی وی ڈرامے اور فلمیں محدود سی ہیں۔امریکی ہالی ووڈ کئی اعتبار سے تمام دنیا کی شوبز انڈسٹری میں بہت آگے ہے۔فلم اور ڈرامہ کے شعبہ میں اس کا معیار بالخصوص بہت اچھا ہے۔خرابی مگر یہ ہے کہ مغرب کے رہنے والوں کا اخلاقی معیار ہم اہل مشرق سے ذرا مختلف ہے۔کب، کہاں کوئی عریاں یا نیم عریاں سین آجائے، کوئی پتہ نہیں چلتا۔اس لئے اہلِ خانہ کے ہمراہ تو کیا اس کے بعض انٹرٹینمنٹ پروگرام اکیلے بیٹھ کر بھی نہیں دیکھے جا سکتے ہیں۔رہی بات ہندوستانی بالی ووڈ کی طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ باقی تمام شعبہ جات میں ہالی ووڈ سے چاہے جتنے بھی پیچھے اور پچھڑے ہوئے ہوں مگر فحاشی اور عریانی میں برابر کی چوٹ دیتے ہیں۔بعض اوقات تو بھارتی تفریحی پروگرام ہالی ووڈ کو بہت پیچھے چھوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ایسے کثیف ثقافتی ماحول میں ''ارطغرل'' ایک تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہو رہا ہے۔

بعض قارئین یہاں جز بز ہوں گے کہ ابن عربیؒ سے یکدم بات شوبز انڈسٹری کی طرف کیسے آن پہنچی؟ کہاں تصوف میں ڈوبے سالک وصوفی اور کہاں فلم، ٹی وی سکرین کی چکاچوند کے مارے لوگ؟ بات کچھ ایسی بے جوڑ اور ان مل بھی نہیں ہے۔مختصر سا قصہ یہ ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے بانی فاتح کی زندگی اور جدوجہد پر مبنی ڈرامہ ''ارطغرل'' جوان دنوں مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر رہا ہے، اس ڈرامے میں ابن عربیؒ کا بہت اہم کردار دکھایا گیا ہے۔ترک قوم سے اوغوز نسل کے لوگوں کے قائی قبیلے میں جنم لینے والے ہیرو ارطغرل کی زندگی کے ہر اہم موڑ پر ابن عربیؒ کی رہنمائی اور مدد شامل رہی ہے۔متذکرہ ڈرامہ میں ابن عربیؒ کو سب شیخ کہہ کر پکارتے ہیں۔جس کا سبب ابن عربیؒ کا لقب ''شیخ الاکبر'' ہے۔جن ناقدین کے نزدیک ارطغرل اور ابن عربیؒ کا تعلق فرضی یا افسانوی ہے۔ان کی خدمت میں عرض کر دوں کہ دونوں کا تاریخی اعتبار سے ایک ہی عہد ہے۔ابن عربیؒ سن 1165 میں پیدا ہو کر 75 برس کی عمر میں سن 1240 میں خالق حقیقی سے جا ملے اور شام کے شہر دمشق میں مدفون ہیں۔ارطغرل کی تاریخ وفات 1280 ہے اور اس کی قائم کردہ سلطنت تقریباً آٹھ صدیاں قائم رہی۔اس طویل حکمرانی کی نوید ابن عربیؒ نے اپنی زندگی میں ہی ارطغرل کو سنا دی تھی۔مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ معیاری تفریح کے ساتھ ساتھ پاکستان کے عوام کو اسلامی تاریخ سے شناسائی ہو رہی ہے، علاوہ ازیں اسی بہانے ایک ولی کامل ابن عربیؒ سے نوجوان نسل متعارف ہو رہی ہے۔اس خوبصورت ترک ڈرامے کو اردو میں ڈھالنے اور پیش کرنے پر پی ٹی وی مبارکباد کا مستحق ہے۔

عامر بن علی/ جاپان

شہروں شہروں دیس میں خوف کا پہرہ ہے
کہتی ہے سرکار یہ دور سنہرا ہے
کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہو پایا ہے
گونگی ہے جنتا یا حاکم بہرہ ہے
کب تک قید کرو گے سورج سوچو تو
برف کا تاج و تخت کہاں کب ٹھہرا ہے
عدل تو گھر کی باندی ہے ان شاہوں کی
موت کے بعد سنا ہے ایک کٹہرا ہے
دھرتی کو سب وید بہت نادان ملے
زخم تو ہے لیکن کب اتنا گہرا ہے

عبدالوحید بسمل/ ایبٹ آباد

ستائے، رُلائے ، منائے ہمی کو
محبت کے کلیے بتائے ہمی کو
مقابل کو تولے ترازو میں ہم سے
رقابت کے ڈر سے ، گھٹائے ہمی کو
سبھی کو بلائے کہ دیکھے زمانہ
زمانے کے ڈر سے چھپائے ہمی کو
ہمیں ساتھ لے کر جو نکلے وہ ڈر سے
سنا کے کہانی ڈرائے ہمی کو
خدایا کوئی ایسی تبدیلی آئے
وہ اپنا سمجھ کر بلائے ہمی کو
کسی روز دریا کے پانی سے کھیلے
اکیلا وہ پہلو میں پائے ہمی کو
چلو یار بسمل کبھی اس سے ملنے
کہ حسرت ہماری ستائے ہمی کو

پاکستان کے سوئٹزرلینڈ میں

لبنیٰ صفدر/لاہور

قدرت اپنی دلکشی، اپنے حسن سے دلوں کو قابو کر لیتی ہے، روح کو محسوس کر لیتی ہے، خدا کو قریب سے دیکھنے کی چاہ ہو تو مظاہر فطرت کو قریب سے دیکھ لیں۔ ہر رنگ اور ہر رُوپ میں اُس کی جلوہ گری ششدر کر دیتی ہے۔

سوات کو قریب سے دیکھنے کا تجربہ زندگی کے حسین ترین تجربات میں سے ایک تھا۔ من پسند ہم سفر ساتھ ہو تو زندگی کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ ماہ جولائی میں پروگرام تشکیل پایا۔ یہ سفر لاہور سے اسلام آباد، اسلام آباد سے مینگورہ اور مینگورہ سے وادی کالام تک رات کے دو بجے آغاز ہوا اور اگلے دن تقریباً" اسی وقت میں اختتام پذیر ہوا۔ لاہور سے مینگورہ تک گرمی کی حالت ایک جیسی تھی۔ سفر کے دوران تو اس کا اندازہ ایئر کنڈیشنر کی وجہ سے کچھ زیادہ نہ ہو سکا لیکن مینگورہ کچھ دیر ٹھہرنے پر پتہ چلا کہ لاہور اور مینگورہ کے موسمی حالات کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں لیکن مینگورہ سے جوں جوں آپ کالام کی جانب بڑھنے لگتے ہیں موسم دھیرے دھیرے انگڑائی لے کر ٹھنڈا اور خوشگوار روپ دھارنے لگتا ہے، نرم خوشبو بھری ہوا گالوں کو چھو کر گزرتی ہے تو رُوح تک میں ایک عجیب سی سرشاری بھر جاتی ہے۔ ویسے تو وادی سوات کا سارا سفر آپ کو ہر لمحہ سرشار رکھتا ہے روح کو گویا ایک نئی زندگی بخش دیتا ہے۔ وادی سوات اپنی فطری خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ سفر میں پرشور دریا آپ کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگتا ہے اور کہیں پر بھی آپ کا اور دریائے سوات کا ساتھ نہیں چھوٹتا، دریائے سوات کی وفاداری ہر طرف آپ کا ساتھ نبھاتی ہے۔ بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں نیلگوں اور کہیں زمردی پانی آپ کی بصارتوں کو کہیں اور متوجہ ہونے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ یہ زمردی پانی کہیں دریا کے روپ میں، کہیں صاف و شفاف اُجلی آبشاروں کے رنگ میں رقص کرتا ہے تو کہیں دھیرے دھیرے دھنک رنگ لئے آپ کے قدموں میں بچھنے لگتا ہے تو زندگی کا سارا حسن سمٹ کر آپ کی بانہوں میں آجاتا ہے۔ سوات کا ذکر قدیم کتب میں بھی ملتا ہے۔ قدیم کتب میں اسے Udyana کے نام کے ساتھ لکھا گیا ہے جو کہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں باغ و گلستان۔ یعنی قدیم دور میں بھی اس وادی یا خطہ کی خوبصوری کی بنائی پر اس کو اس نام سے پکارا گیا۔ ایرانی، یونانی اور بدھ مت کے پیروکاروں نے وقتاً" فوقتاً" اس خطہ پر حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ قدرتی حسن اور دولت سے مالا مال اس علاقے کی توجہ دوسروں کی نگاہ کا مرکز بنی رہی۔ دریائے سوات کو عہد قدیم میں Swanlu کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ سکندر اعظم کے دور میں یونانی مورخوں نے اسی نام سے اسکا ذکر کیا ہے۔ Swanlu کا لفظ Sweta سے نکلا ہے جس کے معنی سفید یا شفاف کے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ صدیوں قبل سفید و شفاف اُجلے اور مقدس پانی کی شکل و ہیئت اور تاثیر آج بھی اسی طرح سے محفوظ ہے۔ میں نے اپنے اس سفر کے دوران بار بار دل سے دُعا کی ہے کہ خدا اس کے اُجلے شیشے جیسے شفاف پانی کو اسی طرح پاک اور مقدس رکھے اور دُنیاوی آلودگیوں سے بچائے رکھے۔ خدا اس کے سرسبز حسن کو تا قیامت اسی طرح شاداب رکھے۔ اس کے نیلگوں سبز زمردی، سفید اُجلے اور چمکیلے پیرہن پر کوئی داغ نہ لگنے پائے۔ جگہ جگہ آپ کو پانی کے مختلف شیڈز نظر آتے ہیں۔ کہیں ہلکا سبز تو کہیں گہرا زمردی، کہیں نیلگوں جیسے آسمان اُلٹ کر اس کی تہہ میں چلا گیا ہو۔ کہیں آبشاروں کے رُوپ میں اتنا سفید اور مقدس کہ پاؤں ڈالتے ہوئے بھی ڈر لگے کہ میلا نہ ہو جائے۔ زندگی کا تمام سکون اور دل کی ٹھنڈک اس کی آغوش میں بیٹھتے ہی آپ کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ وادی سوات میں کسی دیر پا حکومت کے قیام کا تاریخ میں پتہ نہیں چلتا۔ اگرچہ ہلکا سا حوالہ بدھ مت دور حکومت کا ملتا ہے۔ اُسی دور میں سڑکوں کی داغ بیل ڈالی گئی اور نئی آبادیاں وجود میں آئیں۔ ہندو شاہیہ نے بھی یہاں پڑاؤ ڈالنے کی کوشش کی لیکن سلطان محمود غزنوی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے ارادوں کو مسمار کر دیا۔ مغل، درانی، سکھ اور انگریز سب اپنی اپنی طاقت آزماتے رہے لیکن کوئی بھی اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ 1850ء میں آخر کار سید اکبر شاہ نے باقاعدہ یہاں پر شرعی حکومت کی داغ بیل ڈالی لیکن ان کی وفات کے بعد سوات دوبارہ قبائلی دور میں چلا گیا۔ بعد ازاں میاں گل عبدالودود نے یہاں ایک منظم حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جو رفتہ رفتہ جدید فلاحی ریاست کی صورت اختیار کر گئی۔

میرے شوہر نے اپنے جمالیاتی ذوق کی بناء پر ایسا ہوٹل اور کمرہ کالام میں دریائے سوات کے کنارے ڈھونڈ ہی لیا جس کی کھڑکیوں کے پردے

سرکاتے ہی موجیں مارتا اٹھکیلیاں کرتا دریا بالکل چند منٹ کے فاصلے پر دکھائی دیتا۔دن رات کمرے کی کھڑکیوں سے اور کمرے سے نکلتے ہی بس دو چار قدم کے فاصلے پر بہتے اس آب حیات کا دلکش نظارہ ذہن ودل پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گیا ہے۔ ہر وقت کمرے میں آتے جاتے دریا کا نظارہ باقی ٹور کے تجربے سے الگ اور منفرد تجربہ تھا۔بحرین سے کالام تک کے سفر میں دریا کے ساتھ فلک بوس سرسبز وشاداب پہاڑوں کا طویل سلسلہ عجیب بہار دکھاتا ہے۔ پہاڑوں کے سینوں پر پیوستہ دراز درخت،جھونپڑی نما خوبصورت رنگوں سے پینٹ شدہ گھر، چلتے پھرتے لوگ اور مویشی، ہرے بھرے کھیت جو نہایت منظم انداز میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔ یہ تمام مل کر کسی مصور کی یہ بڑی بڑی پینٹنگز آپ کو حیرت کدہ میں لے جاتی ہیں۔ایسا حیرت کدہ جس میں سے باہر آنا مشکل ہوجاتا ہے۔ایک طلسم ہے جو آپ پر طاری ہوجاتا ہے۔

شام کو کالام کی مال روڈ گھومنے کا پروگرام بنا، مال روڈ نہایت خوبصورت ہے،صاف ستھرے روڈ پر تمام دکانیں اتنی خوبصورتی اور نفاست سے سجائی گئی ہیں جس سے اہل ذوق کے شوق کا پتہ ملتا ہے۔ ہر دکان میں اشیاء کو نفاست اور خوبصورتی سے اسی طرح سجایا گیا ہے ۔یہ دیکھنے اور خریدنے دونوں کو مہمیز دیتی ہیں۔ میں نے یہاں سے سواتی شال اور بیٹی کے لئے چترالی فراک خریدا۔لوگ عمدہ اخلاق کے مالک ہیں۔ کچھ باتیں یہاں قابل غور ہیں میں نے کسی ایک شخص کے ہاتھ میں بھی سگریٹ اور پان کی ڈبی نہیں دیکھی۔کسی نوجوان کو ہیڈ فون کانوں میں لگا کر ڈرائیونگ یا واک کرتے نہیں دیکھا ،سڑک کے کنارے بیٹھ کر موبائل پر خوش گپیاں لگاتے نہیں دیکھا۔اگر کسی نے موبائل رکھا ہے تو وہ اسکا استعمال ضروری فون سننے اور کرنے کی حد تک استعمال کرتا ہے۔ مال روڈ پر حتیٰ کہ اردگرد کے علاقہ میں کوئی ایک رکشہ بھی نظر نہیں آیا۔موٹر سائیکل سوار بہت کم گزرتے ہیں۔زیادہ لوگ خواہ وہ نوجوان تھے یا بوڑھے پیدل چلتے ہی نظر آتے ہیں یہی ان کی صحت کا راز بھی ہے۔ان تمام اشیاء کی غیر موجودگی نے کالام کو بہت سی نجاستوں اور خباثتوں سے پاک رکھا ہوا ہے۔آب وہوا کی طرح لوگوں کے عادات وفضائل بھی صاف ستھرے اور طرز زندگی سادہ ہے۔اس پورے ٹور میں ہم نے منرل واٹر کی بجائے چشمے کا پانی پینے کو ترجیح دی۔یقین مانئے یہ دُنیا کے تمام منرواٹرز سے زیادہ شفاف، زیادہ فرحت بخش ہے۔خواہمخواہ آپ کو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد یہ پانی پینے کی خواہش جاگتی ہے۔ اگرچہ ہم نے مال روڈ پر واقع ہوٹل سے اکثر تعتل غزائیں کھائیں لیکن شاید یہ اسی پانی کا کمال تھا کہ طبیعت میں ایک بار بھی بوجھل پن سی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔ اخروٹ، بادام، سیب ، آلوچہ، آڑو، ناشپاتی یہاں کے خاص پھل ہیں۔ جگہ جگہ اخروٹ کے درخت آپ کو سڑکوں کے کنارے کنارے ہی نظر آتے ہیں۔ان زرخیز پہاڑوں پر لوگوں نے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر اپنی فصلیں بھی اُگا رکھی ہیں۔جن میں گوبھی اور شلجم عام نظر آئے۔ کھیتوں کی حدود مقرر کرنے کے لئے پتھروں سے چھوٹی دیوار بنادی جاتی ہے۔پتھروں اور لکڑی کے امتزاج سے خوبصورت عمارتیں بھی جابجا آپ کو نظر آئیں گی۔

اگلا دن میوٹنڈ جھیل پہ جانے کیلئے ہم نے مقرر کیا لہٰذا صبح سویرے ناشتہ کرتے ہی میوٹنڈ جانے کی تیاری پکڑی۔جس کے لئے ہم نے جیپ کا انتظام ایک دن پہلے سے ہی کرلیا تھا۔ اپراوشو ویلی پر کالام سے تقریباً 40 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں پر جانے کے لئے زیادہ تر جیپ کا استعمال ہی کیا جاتا ہے۔اگرچہ لوگ کاروں میں بھی سفر کرتے نظر آتے ہیں۔کیونکہ بلند وبالا پہاڑوں کے کناروں کو کاٹ کر بنائے گئے راستے پر طاقتور انجن والی گاڑی ہی چل سکتی ہے۔راستہ کافی پرخطر ہے۔بعض اوقات تو گمان گزرتا ہے کہ شاید جیپ کے دو پہیے سڑک پر اور دو لب سڑک اللہ کے بھروسے پر ہی چلے جارہے ہیں۔ یہاں بھی تمام سفر میں کہیں بہت گہرائی میں، کہیں کم گہرائی میں دریا آپ کا ہمسفر ہی ہے۔جگہ جگہ خوبصورت آبشاریں مسافروں کا دامن پکڑ کر روک لیتی ہیں۔ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ ان آبشاروں پر رُکے بغیر آگے بڑھ جائیں۔آبشاروں کا ٹھنڈا یخ پانی سیاحوں کو مجبور کردیتا ہے کہ وہ کچھ پل ٹھہر کر اپنے پاؤں ڈبو کر بیٹھے رہیں۔دریا کے کنارے آبشاروں پر جہاں جہاں بھی بوتلیں اور ٹن پیک بک رہے تھے۔اس کے لئے خاص طور پر لکڑی کے فریم میں ان ڈرنکس کو ترتیب سے رکھ کر پائپ کے ذریعے دریا کے پانی سے ان کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ یہ پانی پھوار کی صورت تمام بوتلوں کو بھگوتا رہتا ہے۔ پانی کی یخ بستگی ڈرنکس کو اسی طرح ٹھنڈا رکھتی ہے جس طرح ہم اشیاء کو فریج یا فریزر میں رکھ کر ٹھنڈا کرتے ہیں۔ اس سفر مین پہاڑوں پر بہت سی بستیاں بسی ہوئی ہیں۔لوگ اپنے کام کاج میں مگن نظر آتے ہیں جبکہ بچے ہر گزرنے والے سیاح کو نہایت پرشوق نظروں سے دیکھتے ہیں۔معصوم نظروں اور چہروں والے یہ بچے اکثر گروپ کی صورت میں نظر آئیں گے۔لڑکیاں

بھی نظر آتی ہیں۔ جبکہ جوان خواتین شاذو نادر ہی نظر آئے گی۔ جس کی وجہ یہاں کا کلچر ہے۔ اوشو، مٹلتان میں کافی آبادی ہے اور یہ پُررونق جگہیں ہیں۔ کالام سے مہوڈنڈ کے راستے میں جگہ جگہ آپ کو کیمپنگ نظر آتی ہے رنگ برنگے کیمپس اہلیان شوق کے ذوق کا پتہ دیتے ہیں۔ یہاں الگ سے ایک دُنیا آباد ہے طرح طرح کی اشیائے ضروریہ سے مزین دکانیں نظر آتی ہیں، درختوں کے ساتھ خوبصورت لائٹس کا انتظام کیا گیا ہے جو رات کو جگمگاتی ہیں تو عجب سماں ہوتا ہے۔ وادی کالام کی بالائی گھاٹی کی برفانی الپائن پہاڑوں کے درمیان واقع یہ سبز رنگ، زمردی جھیل سیاحوں کی جنت ہے۔ یہاں جانے کے بعد لگتا ہے کہ واقعی آپ جنت کے کسی گوشے میں پہنچ چکے ہیں۔ سب کچھ خواب ناک، رومانٹک اور پریوں کے دیس جیسا لگتا ہے بلندوبالا سفید برف سے ڈھکی پہاڑیوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ پریاں یہیں کہیں بسیرا کرتی ہیں۔ پہاڑوں کے حصار میں بہتی سبز جھیل کا پانی کسی دیومالائی داستان میں بیان کردہ جھیل سا لگتا ہے۔ اسی وجہ سے سیاح اور شائقین کا ہمہ وقت رش لگا رہتا ہے۔ اپنے ٹھنڈے یخ پانی اور ٹراؤٹ جھیلوں سے بھری یہ جھیل کالام سے تقریباً 40 کلومیٹر پر وادی اوشو میں واقع ہے۔ اس جھیل کی لمبائی تقریباً 2 کلومیٹر ہے۔ دو کلومیٹر کا یہ حسین ترین خطہ جس میں مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے جزائر بھی نظر آتے ہیں۔ اونچے شاداب درختوں سے اور نرم گھاس سے بھرے ہوئے۔ دل چاہے کہ بس باقی زندگی یہیں پر بسیرا کرلو اور نگاہوں کو اس دلکشی و رعنائی سے سیراب کرتے رہو۔ قطار در قطار کھڑی کشتیاں مسافروں کو اس دلکشی کے قریب تر لے جاتی ہیں یہاں پر اک اور بات قابل توجہ ہے۔ ہر کشتی پر پاکستان کا بڑا سا لہراتا ہوا سبز پرچم آپ کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ آپ اپنے وطن کے کتنے حسین خطہ میں موجود ہیں ساتھ ہی ساتھ مقامی لوگوں کی وطن سے محبت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ یہ لوگ انتہائی سادہ اور محبت کرنے والے ہیں۔ انٹرنیٹ کی دُنیا سے دور ان کی خوبصورت اور خالص زندگی فضاء کی طرح پاکیزہ معلوم ہوتی ہے، نوجوان بچے لعل ہار سنز لے کر گھومتے ہیں اور جھیل کنارے بچوں اور بڑوں کو سیر کرواتے ہیں۔ کشتی کی سیر سے قبل ہی مجھے بھوک نے ستانا شروع کردیا۔ میں نے آپ کو بتایا کہ چشمے کا پانی آپ کا ہاضمہ بالکل درست کردیتا ہے۔ ہم نے ناشتہ بھی ذرا ہلکا پھلکا کیا ہوا تھا تاکہ سفر میں طبیعت میں بوجھل پن پیدا نہ ہو۔ بھوک کا اظہار میں نے اپنے شوہر سے کیا تو اُنہوں نے فوراً وہاں ایک جگہ کا انتخاب کرکے ہم دونوں ماں بیٹی کو بٹھایا اور قریبی ہوٹل جو ایک خیمے پر مشتمل تھا چکن کڑاہی کا آرڈر دے دیا۔ اس خیمے کے باہر سفید مرغیاں دانہ چگ رہی تھیں ایک عمر رسیدہ شخص ہمارے سامنے ان میں سے ایک مرغی پکڑ کر خیمے کے اندر لے گیا۔ مرغی کو ذبح کرکے خیمہ کے اندر موجود باورچی خانہ میں پکانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہم جب تک اس پر فضاء مقام پر بیٹھ کر رنگین نظاروں میں گھرے خوش گپیاں کرتے رہے۔ خیمے کے اندر تازہ ذبح شدہ مرغی کی کڑاہی ہمارے لئے تیاری جارہی تھی۔ چکن کڑاہی عام چکن کڑاہی سے ذائقہ اور شکل وصورت میں یکسر مختلف تھی۔ خیر یہ بھی یہاں کے لوگوں کی سادگی کو ظاہر کررہی تھی۔ جھیل کے اردگرد جنگلات میں سانپوں کی موجودگی کے بارے میں بتایا جاتا ہے اگرچہ ہم نے اس دوران کسی سانپ کو نہیں دیکھا تمام راستے اور جھیل کے اردگرد سبزے میں ننھے منے پیلے اور گلابی پھول اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ مہوڈنڈ کو Lake of Fishes بھی کہا جاتا ہے۔ موسم سرما کے دوران مہوڈنڈ جھیل جم جاتی ہے اور بھاری برف کی تہہ بن جاتی ہے گرمیوں میں جھیل کا بین الپائن پھولوں کی چادر سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ جیسے جیم نیلی پوست، پوٹینٹیلا اور جینٹین وغیرہ۔

مہوڈنڈ جھیل بالائی اوشو وادی ہندوکش پہاڑی سلسلہ پر واقع ہے اور اونچائی 9603 فٹ، 2927 میٹر ہے۔ مقامی لوگ اسی پانی کو خوراک میں استعمال کرتے ہیں اور یہی پانی ان کے لئے بجلی پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ کالام سے مہوڈنڈ کا سفر تقریباً 3 گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ آنے اور جانے کے 6 گھنٹے بظاہر دشوار گزار پہاڑی راستوں پر تھکا دینے والے معلوم ہوتے ہیں لیکن اس جنت سے واپسی پر سوائے خوشگوار یادوں کے کوئی چیز آپ کو پریشان نہیں کرتی۔ تھکاوٹ تو چھو کر بھی نہیں گزرتی۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ واپس آکر شام کو ہم نے پھر سے کالام کے مال روڈ کا دورہ کیا اور شام کا کھانا ہوٹل سے کھایا۔

اگلا پڑاؤ ہمارا سوات کی ایک اور خوبصورت جگہ بحرین Behrain تھا۔ بحرین کا مطلب (دو دریا) ہے۔ دریال اور سوات کے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کو یہ نام دیا گیا ہے۔ یہ قصبہ مینگورہ سے 60 کلومیٹر شمال میں دریائے سوات کے دائیں کنارے 4700 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ بحرین میں سوات کے خوبصورت کنارے پر جگہ جگہ تفریحی مقامات بنائے گئے ہیں۔ خوبصورت ہوٹلز بھی شائقین کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ یہاں رُکے بغیر آگے نہیں

بڑھ سکیں گے۔ بحرین کا بازار مقامی اشیاء کے لئے مشہور ہے۔ روایتی لباس، ٹوپیاں اور جیولری نیز دیگر دستکاری کی اشیاء کے بے شمار دکانیں نظر آتی ہیں۔ ایک دکان پر ہم نے کچھ دیر قیام کیا تو دکاندار نے فوراً ہمیں پشاوری قہوہ کی دعوت دے دی جسے ہم نے بغیر پس وپیش کے قبول کرلیا۔ اگر وہاں کے میزبان فیاض ہیں تو ہم نے مہمان ہونے کے ناطے اس فیاضی کا خود بھی مظاہرہ کیا۔ ویسے بھی پشاوری قہوہ کی کشش ایسی ہے کہ کون اس پیش کش کو ٹھکرا سکتا ہے۔ قہوہ واقعی لاجواب تھا۔ یہیں پر ایک پشتون خوبصورت بچی ہمارے پاس آکر بیٹھ گئی۔ مخصوص جیولری اور مقامی لباس زیب تن کئے معصوم چہرے والی بچی ہمیں پرشوق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس دوران اس کی ارینہ سے دوستی ہوگئی۔ دونوں کافی دیر آپس میں کھلتی رہیں۔ اگرچہ پشتو زبان ہماری سمجھ سے باہر تھی اور بچی بھی اردو سے ناآشناء تھی لیکن محبت کے اظہار کے لئے زبان بے معنی ہوجاتی ہے ہمیں آپس کی ہر بات سمجھ آرہی تھی۔

یہاں کے آلو بخارے شکل وصورت میں ہمارے پنجاب میں پائے جانے والے آلو بخاروں سے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ اب ذائقہ کیسا ہوتا ہے یہ بتانے سے تو میں بھی قاصر ہوں کہ یہ آلو بخارے چکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک دکان پر کھڑے ہوکر میں نے آلو بخارے کی قیمت پوچھی بابا جی نے مجھے قیمت نہیں بتائی بلکہ کہا کہ یہ مت خریدو یہ ابھی بہت کھٹے ہیں۔ بابا جی کی معصومیت میرے لئے حیران کن تھی۔ ورنہ یہاں تو کھٹے آلو بخارے بھی ہوتے تو شہد کی طرح میٹھے بول کر ہمارے ہاتھوں میں تھما دیئے جاتے۔ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔ دوپہر کا کھانا یہیں کھایا۔ جس ہوٹل میں آپ کھانا کھائیں گے دریا کا حسین نظارہ کھانے کے لطف کو دوبالا کردے گا۔ ہم نے بھی جس جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا خوبصورت ٹھاٹھیں مارتا سوات کا دریا بار بار ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرتا رہا۔ دریائے سوات کی تیز رفتاری اور شور کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ تیرے پانی یونہی رواں دواں رہیں اور دنیاوی آلائشوں سے تیرا وجود اسی طرح پاک وصاف رہے۔ شام تک بحرین کے مختلف مقامات سے آنکھوں کو سیر اور دل کا ٹھنڈا کرنے کے بعد کالام واپسی ہوئی۔ یہ خیبر پختونخواہ کا تیسرا بڑا اور پاکستان کا 26واں بڑا شہر ہے۔ مینگورہ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ لوپنر، ٹبکارا، روم اور ماتالائی میں اطالوی ماہرین آثار قدیمہ نے 475 ہند آریائی قبریں بھی دریافت کیں۔ جن کی تاریخ 1520 سے 170 قبل مسیح ہے۔ کہتے ہیں کہ گنگا کے میدانی علاقوں سے راہبوں کی آمد سے اس علاقے میں بدھ مت پیدا ہوا۔ یہ علاقہ اشوق کے بھیرہ روم اور مغربی ایشیاء سے مغربی علاقوں تک بودھ مشنریوں کی توسیع کے لئے ایک لانچنگ گراؤنڈ بن گیا۔ وادی جمبیل میں مینگورہ کے قریب بدھ مت کی بہت سی باقیات اور نقش ونگار دریافت ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی یہاں بہت سی اشیاء دریافت ہوئی ہیں جن کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ 2007ء میں طالبان نے یہاں پر حملہ کیا جس کے نتیجہ میں روایتی ثقافت کو بڑی حد تک نقصان پہنچا۔ اس تمام شورش کے بعد بھی مینگورہ کا حسن قائم ودائم ہے۔ اگرچہ یہاں کی فضاؤں میں ظلم وتشدد کی بہت سی داستانوں کے نقوش رقم ہیں۔ رات کے وقت مینگورہ شہر کا نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پہاڑوں کے حد نظر تک پھیلے سلسلے پر لاکھوں گھروں میں جگمگاتی روشنیاں مسحور کن اور پراسرار سے حسن کی فضاء بناتی ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں جگمگاتے اور ٹمٹماتے ان جگنوؤں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ جیسے کسی نے آسمان کی چادر پر ایک کونا پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا ہو اور ہزاروں ستارے ٹوٹ کر ان پہاڑوں کے دامن پر آکر بکھر گئے ہوں یا جیسے ستاروں سے بھرا آسمان ان پہاڑوں سے ہم آغوش ہوگیا ہو۔ شہر کی آب وہوا اسی طرح سے گرم اور حبس زدہ معلوم ہوئی جس طرح آج کل میں لاہور کی معلوم ہوتی ہے۔ ملالہ یوسف زئی کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے۔ پورے سفر کے دوران جگہ جگہ پر کھلے سکول اور سکول جاتے بچے اس بات کے گواہ تھے کہ یہاں تعلیم کی صورت حال اس قدر مخدوش نہیں ہے جس طرح سے پیش کیا جاتا ہے۔ میں طلباء اور طالبات کو بہتات میں سکولوں کو رواں دواں دیکھا۔ باپ اکثر اپنی بیٹیوں کے ساتھ بازاروں وغیرہ میں نظر آئے۔ اگرچہ جوان عورتیں اور بچیاں کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جہاں تک عورتوں کی تعلیم کا تعلق ہے۔ تو ایسا تو پنجاب اور دیگر صوبوں میں بھی ہے کہ اُن کی تعلیم کو ریشو لڑکوں سے کم ہے۔ سوات اور خیبر پختونخواہ سے اس کو ظلم وجبر کا نشان بنا کر پیش کردینا کم ازکم مجھے تو غلط ہی لگا۔

فارمر پاکستانی چیف جسٹس ناصر الملک بھی یہاں سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ مشہور گلوکاراؤں میں نازیہ اقبال اور غزالہ جاوید کے نام قابل ذکر ہیں۔ مینگورہ سے لاہور واپسی کا سفر شروع ہوا۔ اگرچہ کئی گھنٹوں کا سفر اپنے گھر آکر تمام ہوا لیکن میری آنکھیں، میرا دل اور میری رُوح ابھی تک وادی سوات میں بھٹک رہے ہیں۔

ابّو جی

شہزاد نیرؔ/جاپان

ماں باپ پر لکھتے ہوئے یادوں کے ایسے تابڑ توڑ حملے ہوتے ہیں کہ قلم شکست کھا جاتا ہے۔ کئی بار لکھنا چھوڑ کر ماضی کی لہروں پر ڈولنا اور یادوں کی رَو میں بہتے چلے جانا اچھا لگتا ہے۔ خیالوں کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے جو کچھ اپنے والد صاحب کے بارے لکھ سکا وہ پیشِ خدمت ہے۔

شناختی کارڈ کے مطابق ابو جی 1948ء میں پیدا ہوئے۔ اس سال کا اندراج بھی دادی کے ایک یاد داشتی بیان کا مرہونِ منت ہے۔

''لوٹ مار ختم ہو گئی تھی۔ ہندو سکھ جا چکے تھے۔ اُدھر سے مسلمان آ کر ہندوؤں سکھوں کے گھروں میں آباد ہو چکے تھے۔ جب میرا محمد رفیق پیدا ہوا''۔

شاید یہی سبب تھا کہ ابو جی کے شناختی کارڈ پر صرف پیدائش کا سال درج تھا۔ دن اور مہینے کا کچھ مذکور نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے۔ دادی دادا کو جنوری فروری مارچ آتے نہ تھے، شناختی کارڈ والے پھاگن چیت، اسوج کاتک لکھتے نہ تھے۔ ابو جی آٹھ سال کے ہوئے تو اپنے والد کے ساتھ کھیتوں پر جانے لگے ہمارے دادا جی ٹھیکے پر زمین کاشت کرتے تھے۔ ان دنوں ابو کا کام بس کنویں کے بیل ہنکائے رکھنا تھا۔

کنواں عمر کے آخری برسوں تک ان کے ساتھ رہا۔ کنویں کے آلات اور ساز و سامان کے نام، تمام کے تمام، عمر بھر انہیں یاد رہے۔ وہ کنویں کو بطور استعارہ استعمال کر کے ہمیں زندگی کی کئی باتیں سکھاتے تھے۔

☆ سر پہ نگران نہ ہو تو کنویں کے بیل بھی رُک جاتے ہیں۔

☆ کاروبار کنویں کی مثال ہوتا ہے۔ ایک بالٹی پانی نکال لو یا ڈال دو، اسے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

☆ کنویں کی ماہل (زنجیر) کے ساتھ کئی ٹِنڈیں (برتن) بندھی ہوتی ہیں۔ ماہل چلتی ہے تو کوئی ٹِنڈ پوری بھری ہوئی آتی ہے، کوئی آدھی تو کوئی پونی۔ سب اپنا اپنا پانی پاڑچھے میں انڈیل دیتی ہیں۔ پھر کچھ پتہ نہیں چلتا کس نے کتنا پانی ڈالا''۔ اس مثال سے وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ساجھے کے کاروبار میں زیادہ حساب کتاب نہ کرو کہ کون کتنا کام کر رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ چلتے کاروبار میں پروڈکشن بڑھانے پہ دھیان دو کوئی آئٹم زیادہ منافع دے جائے گی تو کوئی کم۔ کنواں چلتا رہے تو پانی بہتا رہے گا۔

☆ کنواں چلا کر یہ بھی دیکھو کہ ساری ٹِنڈیں خشک تو نہیں آ رہیں (کوشش کے ثمر پر بھی نظر رکھو)

☆ جب کسی کام کی آمدن اُسی پر خرچ ہو جائے تو کہتے ''کنویں کی مٹی کنویں پر ہی لگ گئی''۔

ہمارے بچپن میں سردیوں کی لمبی راتوں کی ایک دلچسپ سرگرمی ''بجھارتیں بُوجھنا'' تھی۔ امی کے پاس پہیلیوں کا وسیع ذخیرہ تھا۔ ''ماں جمی نئیں، پُت کوٹھے تھے'' (ماں پیدا نہیں ہوئی، بیٹا چھت پر پہنچ گیا) ہم سب ہار جاتے تو وہ کہتیں ''آگ اور دھواں''۔

''ماں لیراں پتیراں، پُت ٹِگ مُگلا''۔ (ماں کترنوں کی طرح بکھری ہوئی اور بیٹا موٹا تازہ، گول مٹول)۔ پھر یہ جانتے ہوئے کہ ہم یہ بجھارت نہ بوجھ پائیں گے، خود ہی بتا دیتیں ''تربوز کی بیل اور تربوز'' امی کے برعکس ابو کی پٹاری میں ایک ہی پہیلی ہوتی۔

آ ٹانگا، پا ٹانگا، وچ ٹلم ٹلیاں۔ آون کونجاں دین بجڑے، اسی ندی نہاون چلیاں...... اس بجھارت کا اُردو ترجمہ بہت مشکل ہے۔ آزاد مفہوم یہ ہے کہ ایک تانگے میں دوسرا تانگا پرویا ہوا ہے۔ اس کے بیچ گھنٹیاں بندھی ہیں۔ کونجیں آتی ہیں، بچے دیتی ہیں اور پھر کہتی ہیں ہم ندی میں نہانے جا رہی ہیں۔''

اتنی پیچیدہ اور طویل بجھارت ہم کیسے بوجھ سکتے تھے۔ وہ ایک خوشی سے کہتے۔ ''کنواں اور کنویں کی ٹنڈیں'' (ٹنڈ۔ مٹی کا وہ برتن جو کنویں کی زنجیر سے بندھا ہوتا ہے)

ڈھائی ہزار سال قدیم کنواں (Persian Wheel) آخری عمر تک ان کی یادوں سے محو نہ ہو سکا۔ بات بات میں کنواں آ ٹپکتا۔ ماڈل ٹاؤن (گوجرانوالہ) کے بارے بات کرتے ہوئے کہتے ''جہاں تم قطار اندر قطار پکی کوٹھیاں دیکھتے ہو وہاں دور دور تک کھیت تھے اور ان کو سیراب کرتے بیلوں والے کنویں۔''

ابو کے بچپن کا گوندلانوالہ (گوجرانوالہ) ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ گاؤں کی غیر مسلم آبادی بھارت جا چکی تھی اور جالندھر، امرتسر، ہوشیار پور سے آئے ہوئے پنجابی مسلمان مہاجر آباد ہو چکے تھے۔ دادا جان ایک ایک مکان دکھا کہ ابو کو بتایا کرتے تھے کہ یہ میرے فلاں ہندو دوست یا سکھ یار کا مکان ہوا کرتا تھا۔

دادی بتاتی تھیں کہ پوری ''لُوٹ مار'' (دادی نے ہمیشہ قیامِ پاکستان کو اسی لفظ سے یاد کیا) میں تمہارے دادے نے کچھ نہ لُوٹا۔ لوگ بند گھروں کے تالے توڑ کر سامان نکال رہے ہوتے اور یہ پاس سے گزر کر گھر آ جاتے۔ میں طعنہ دیتی تو غم و غصے سے

کہتے ''اپنے دوستوں یاروں کے گھر لوٹ لوں کیا؟ اپنے اندر کو مار دوں؟'' اپنے اندر کی اچھائی سے یہ اب انسان نے بہتی گنگا میں ہاتھ نہ دھوئے اور غریب کاشتکار ہی رہ گیا۔ آرائیں کو کاشت کاری کے سوا کچھ آتا نہیں اور اتنی زمین تھی نہیں۔ پاکستان بنا تو اتنا ہوا کہ پہلے دادا جان سکھوں کی زمین کاشت کرتے تھے اب مسلمان زمیں داروں کی۔ گھر میں غربت کے ببول اُگے ہوئے تھے۔ دادا جی نے اپنے کم سن بیٹوں محمد صدیق اور محمد رفیق (ابّو) کو کھیتوں میں کام پر لگا لیا۔ ابو جی نے ساری زندگی یہ جملہ فخر سے بولا'' میں سات آٹھ سال کا تھا جب میں نے کام کاج اور محنت مزدوری شروع کر دی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ سخت محنت ابّو کی ہڈیوں میں رچ گئی تھی۔ کام کئے بغیر انہیں چین نہیں آتا تھا۔ کسی دن تھکا دینے والا سخت کام کرتے تو کہتے۔ آج کھانا کھانے کا بھی مزا آئے گا اور نیند بھی اچھی آئے گی۔''

اواخر عمر میں بھی، جب تک ان میں سکت رہی، پوری ذمہ داری سے اپنی فیکٹری میں کام کرتے رہے۔ گھر کی چیزوں کی خود مرمت کرنا یا پاس کھڑے ہو کر کاری گر سے کروانا، ان کا من پسند مشغلہ تھا۔ اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنا انہیں تا حیات مرغوب رہا۔

آئیں واپس ابّو کے بچپن میں چلتے ہیں۔

بیگانے کھیت کاشت کرنے سے آمدن محدود ہی ہوا کرتی ہے۔ اُدھر کنبہ برابر بڑھ رہا تھا دادا نے کسی کے کہنے پر بارہ اور چودہ سال کے دونوں بڑے بیٹے کارخانے میں مزدور بھرتی کرا دیئے۔ گوجرانوالہ پہلے سے ہی لوہے کی صنعت میں مشہور تھا۔ ایوب خان کے دور میں صنعتی ترقی ہوئی تو دھڑا دھڑ نئے کارخانے لگے۔ کھیت مزدور، صنعتی مزدور بننے لگے۔ ابو بتایا کرتے تھے، گاؤں سے شہر تک کا دس کلومیٹر فاصلہ وہ ہنستے کھیلتے پیدل طے کیا کرتے تھے۔ جلد ہی تیسرا بھائی بھی ساتھ مل گیا۔ کچی سڑک پر تانگے چلا کرتے تھے لیکن اتنی عیاشی کسے میسر تھی کہ محنت مزدوری سے کمایا پیسہ کرائے بھاڑے میں اُڑائے۔ منہ اندھیرے روانہ ہو کر رات گئے گھر پلٹنا، کئی سال تک یہی زندگی رہی۔ جانے کب سڑک پکی ہوئی، کچھ آسودگی آئی اور یہ لوگ تانگوں، بسوں پر سفر کر کے شہر گوجرانوالہ جانے لگے۔

ایک واقعہ انہوں نے کئی بار سنایا۔ ابو اور چچا دن بھر کی مزدوری کے بعد پیدل گاؤں آ رہے تھے۔ تھکے ہارے تھے۔ کسی نے زیرِ تعمیر مکان کی چھت پر مٹی ڈالنے کی عارضی مزدوری کی پیشکش کر دی۔ بس پھر کیا، دونوں بھائی جٹ گئے۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد تک سر توڑ محنت کی اور اضافی آمدن کی خوشی اٹھائے گھر لوٹے۔

غریب گھرانوں کے بچے جلدی سمجھدار اور ذمہ دار ہو جاتے ہیں۔ ان وقتوں میں سولہ اٹھارہ سال کے بیٹے کے باپ کو محلّے دار تنبیہہ کرنا شروع کر دیتے تھے کہ اس کی شادی کر دو۔ ابو بتاتے تھے کہ پینسٹھ کی جنگ والے سال ان کی منگنی ہوئی اور اس سے اگلے سال شادی، ہماری امّی، ابّو کی خالہ زاد تھیں۔ ذرا سے خوش حال گھرانے سے آئی تھیں۔ وجہ یہ ہے کہ نانی کے محض پانچ بچے تھے اور دادی کے دس (دو فوت بھی ہوئے تھے!)۔ ابو کی بارات دو سجے ہوئے تانگوں پر سوار کچے راستوں پر قریبی گاؤں قلعہ دیدار سنگھ گئی تھی۔ واپسی پر دلہا اور دلہن الگ تانگوں پر بیٹھ کر آئے!۔ یہ 1966ء کا سال تھا اور ابو کی عمر 18 سال۔ رفتہ رفتہ وہ محض صنعتی مزدور سے ترقی پا کر خراد مشین کے کاریگر بن گئے۔ یہ ان کی زندگی کی ایک بہت بڑی چھلانگ تھی۔ میں سمجھتا ہوں اگر وہ یہ خلیج نہ پاٹتے تو کبھی کارخانوں کے مالک نہ بن سکتے۔ اسی لئے ساری زندگی وہ اپنے استاد (جن سے خراد مشین کا کام سیکھا) کی بے پناہ عزت کرتے رہے۔ باقاعدہ اپنے استاد سے ملنے جاتے حتیٰ کہ وفات سے چند ماہ پہلے تک بھی، فالج کے باوجود، انہیں سلام کرنے جاتے رہے۔ اندر ہی کوئی اعتراف و احترام ہوتا ہے ورنہ کون یوں زندگی بھر شکر گزاری کی رسم نبھاتا ہے۔

شادی کے بعد ابو نے محنت کا دورانیہ بڑھا دیا۔ اکثر اوور ٹائم لگاتے تھے۔ گھر کی چھوٹی موٹی چیزیں اوور ٹائم سے بنتی تھیں۔ ایک ناقابلِ شکست مستقل مزاجی کے ساتھ وہ ذاتی کاروبار کے لئے رقم بھی پس انداز کرتے رہے۔

اُسی زمانے کی ایک یاد میری زندگی کی اوّلین یادوں میں سے ہے۔ چھت پر سردیوں کی خوشگوار دھوپ میں چارپائی بچھی ہے۔ ابو ''لوئی'' اوڑھ کر بیٹھے ہیں ان کی گود میں ہم دونوں بھائی چھپے ہوئے ہیں۔ یہ وہی ''لوئی'' ہے جس کی بابت بُلھے شاہ فرما گئے ہیں۔

چٹی چادر لا سٹ کڑیے، پہن فقیراں لوئی
چٹی چادر داغ لگیسی، لوئی داغ نہ کوئی

اُبولوئی کا کبھی ایک کونہ گرا کر ہمیں چھپاتے ہیں اور پھر اوپر اٹھا کر ڈھونڈ لینے کی ایکٹنگ کرتے ہیں۔ اس کھیل میں کچی اُون کی لوئی ہمیں چبھتی بھی بہت ہے کاش اس لوئی کی چبھن کوئی لوٹا دے!

زندگی بھر ابو جی ایک اصول کا پرچار کرتے رہے۔ سولہ آنے کماؤ تو بارہ آنے خرچ کرو، چار آنے بچاؤ۔ اس پالیسی کو انہوں نے مالی آسودگی کا فارمولا بنا کر دکھایا۔ اپنی بچت سے ذاتی کاروبار شروع کیا اور پھر فیکٹریوں، جائیدادوں کے مالک بنے

لوہا پگھلانے والی بھٹی اور لوہا پھیلنے والے ''زندے'' سے لے کر موٹریں اور پنکھے بنانے والی

فیکٹری تک، مسلسل مشقت اور کامل دیانت کا ایک لمبا سفر ہے۔

میں چوتھی پانچویں میں پڑھتا تھا، گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ مجھے اپنے ساتھ شہر لے جاتے۔ چھوٹے موٹے کام کراتے اور بعد میں خوب پھل کھلاتے۔ ایک دو سال بعد وہ مجھ سے زیادہ کام کرانے لگے ایک دن میری انگلی مشین میں آ گئی اور ناخن کا ایک حصہ کٹ گیا (اب تک وہ ناخن دوسروں سے مختلف نظر آتا ہے) ابو نے کس کر پٹی لپیٹی اور تانگے پر بٹھا کر گاؤں روانہ کر دیا۔ گھر پہنچنے تک پٹی سرخ ہو چکی تھی اور خون بھی ٹپک رہا تھا۔ امی نے سر پیٹ لیا۔ ڈاکٹر سے باقاعدہ نئی پٹی کرائی۔ شام کو ابو گھر آئے تو ان سے خوب لڑائی کی۔ میرا کارخانے جانا موقوف ہوا اور مجھے ٹیوشن پہ ڈال دیا گیا۔ میں آٹھویں نویں میں پہنچا تو ابو کی بہت خواہش تھی کہ پڑھائی چھوڑ کر ان کے ساتھ کاروبار میں لگ جاؤں۔ مصیبت یہ کہ میں پڑھائی میں تیز تھا۔ اہل محلہ سمیت اساتذہ کی بھی یہی رائے تھی کہ اس لڑکے کو پڑھنے دیا جائے۔ 31 مارچ کو نتیجہ آتا تو ہر بار میری اوّل پوزیشن ہوتی۔ وہ رنگین کاغذ میں لپٹے انعام کو دیر تک دیکھتے رہتے اور کچھ سوچتے رہتے۔ بعد میں انہوں نے میرے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لیا حالانکہ وہ پڑھائی میں مجھ سے بھی آگے تھا! گوجرانوالہ کے دستور کے مطابق ابو جی نے ہم بھائیوں کو پہلوانی سکھائی۔ ہمارے مکان کے پیچھے ہمارا اپنا ایک خالی پلاٹ تھا جس میں اکھاڑہ بنا ہوا تھا اسی جگہ ہم نے بھینسیں پال رکھی تھیں۔ سکول کے زمانے میں ہم دونوں بھائی بھینسوں کے لئے چارہ لاتے اور صبح شام اکھاڑے میں کسرت بھی کرتے۔

ابو صبح سویرے ہمیں جگا کر اکھاڑے لے جاتے۔ خود لنگوٹ باندھتے اور ہمیں لنگوٹ باندھنا سکھاتے۔ (ہمارے علاقے میں تکونی شکل کی لنگوٹی ہوتی ہے جسے ''رومالی'' بھی کہتے ہیں)۔ اپنے جسم پر سرسوں کا تیل ملتے پھر ہمارے جسموں پر تیل کی مالش کرتے۔ اس کے بعد اکھاڑہ کھود کر نرم کرنے کا مرحلہ آتا۔ کسّی چلاتے چلاتے سخت سردی میں بھی ہمیں پسینہ آ جاتا۔ اس ساری کارروائی کے بعد کشتی لڑنے اور داؤ پیچ سیکھنے کا مرحلہ آتا۔ وہ ہمارے جسموں پر مٹی ملتے ہم ان کے جسم پر، پھر وہ ہمیں خود کشی کر کے بتاتے ''قینچی'' کیسے مارنی ہے۔ ''دھوبی پٹڑا'' کیا ہوتا ہے۔

پہلوانی پھرتی اور طاقت کا امتزاج ہوتی ہے۔ ساتھ ساتھ اپنی پہلوانی کے قصے بھی سناتے جاتے۔ پہلے وہ ہم دونوں کے ساتھ باری باری کشتی لڑتے پھر ہمیں کہتے کہ آپس میں لڑو۔ کبھی کبھی ہمیں دوڑ بھی لگواتے۔ اس سب کے بعد ہم مٹی میں لتھڑے جسم لئے نلکے تلے بیٹھتے تو سیروں مٹی غسل خانے کے فرش پر جمع ہو جاتی اور سرسوں کے تیل کی پیلاہٹ پانی کی سطح پر تیرتی رہتی۔ گھر پہنچ کر ''سردائی'' تیار کرنے کا مرحلہ آتا۔ مٹی کی کونڈی میں لکڑی کے ڈنڈے سے بادام رگڑ رگڑ کر ہم اس میں ''سنڈھ'' (خشک ادرک) والا پانی ڈالتے جس کی تلخی گلے کو لگتی تو ہم گہری سانسیں لیتے۔

اب سکول کے لئے تیار ہونے کا مرحلہ آتا۔ ابو تگڑا ناشتا کر کے جلدی جلدی موٹر سائیکل (بائیک کا لفظ ہم نے بہت بعد میں سنا) پر سوار کارخانے چلے جاتے اور ہم دونوں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے سکول پہنچ جاتے۔ ہم میٹرک میں پہنچے تو ابو کا کارخانہ ترقی کرنے لگا۔ ہمارے بنے ہوئے پنکھے اور موٹریں راولپنڈی، سرگودھا، فیصل آباد اور بنوں کو ہاٹ جانے لگیں۔ سخت محنت، کاروباری صلاحیتوں اور حساب کتاب کی پکی عادت کے طفیل کاروبار پھیلتا چلا گیا۔

میں حسب فرصت کارخانے کو وقت دیتا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں تو روزانہ جاتا۔ ویسے کبھی کبھار جا کر کھاتے لکھ دیتا۔ چھوٹا بھائی بھی (جو مجھ سے محض دو سال چھوٹا ہے) ہاتھ بٹاتا۔ دسویں کے امتحان کے بعد ابو نے بھرپور کوشش کی کہ میں پڑھائی چھوڑ کر کاروبار میں آ جاؤں۔ گھر میں یہ موضوع کئی ہفتے تک زیر بحث رہا۔ امی کا ووٹ کبھی میری طرف ہوتا کبھی ابو کی طرف۔ اس اثناء میں میٹرک کا نتیجہ آ گیا۔ میرے نمبروں کو دیکھتے ہوئے، اور ایک صنعت کار دوست کے مشورے سے، انہوں نے مجھے ایف سی کالج لاہور میں داخل کرا دیا۔ دو سال بعد چھوٹے بھائی نے میٹرک کیا تو اسی طرح کی کشمکش کے بعد ابو نے اسے کاروبار پر اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ کیا کہتے ہیں ایک ایک اور دو گیارہ۔ کاروبار ترقی کرتا چلا گیا۔

یہاں سکول کے زمانے کی ایک اور کشمکش کا ذکر ضروری ہے۔ اس کشمکش کا نام ہے ''ٹی وی''۔ اس زمانے میں ٹیلی ویژن کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھا جاتا تھا۔ مساجد میں باقاعدہ ''ٹی وی شیطان'' کے خلاف وعظ ہوتے تھے۔ بعض لوگ تو ٹی وی دیکھنا حرام سمجھتے تھے۔ ابو جی روایتی مذہبی ذہن کے مالک تھے۔ ظاہر ہے انہیں ہمارا ہمسائیوں کے گھر جا کر ٹی وی دیکھنا سخت ناپسند تھا ہم بہن بھائی پی ٹی وی کے بے پناہ دلچسپ ڈراموں کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ ہزار بار منع کرتے، ہم دو ہزار بار جاتے۔

شاید میں آٹھویں یا نویں میں تھا جب ابو جی خود گھر میں ٹی وی لے آئے۔ پتھر میں جونک کیسے لگی، اس کا احوال خاصا طویل ہے۔ اختصار اس کا یہ کہ بچے گھر پر رہیں گے۔ کئی سال تک ابو جی خود ٹی وی پر نگاہ نہیں کرتے تھے۔ سوائے اس وقت کے جب اذان نشر ہو رہی ہوتی اور مکہ مدینہ کے مناظر دکھائے

جاتے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے خبریں اور مذہبی پروگرام دیکھنے شروع کر دیئے۔ کچھ دور چل کر قوالیاں اور پھر ریشماں کے گانے..... پتھر پگلا تو پگھلتا چلا گیا پھر بھی ٹیلی ویژن کے ساتھ ان کی دلچسپی کو واجبی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج کل تو ٹی وی کی قبولیت مذہبی حلقوں میں بھی عام ہے۔ 90,80 کی دہائی کے دیہات میں عام لوگ بھی ٹی وی سے متنفر تھے اور اسے گناہ کا گھر سمجھتے تھے۔ ایف ایس سی کے بعد میں آرمی میں چلا گیا۔ وہ خوش تو تھے لیکن بہت زیادہ نہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ میری خوشی سے خوش تھے۔ کافی مہینوں بعد انہیں پتہ چلا کہ آفیسر سلیکٹ ہونے اور سپاہی بھرتی ہونے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہ میری پاسنگ آؤٹ پریڈ پر کاکول (ایبٹ آباد) آئے تو پاکستان ملٹری اکیڈمی کو غور سے دیکھتے رہے ''کتنا پیسہ لگایا ہوا ہے حکومت نے یہاں، گورنمنٹ کے کام گورنمنٹ ہی جانے''۔ پریڈ کی شان و شوکت اور فوجی وردیوں کی چمک دھمک سے وہ کوئی زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ ان کی چہرے پر اتنی ہی خوشی تھی جتنی اپنے بیٹے کو برسرِ روزگار دیکھ کر ہو سکتی ہے۔

ان دنوں میں لیفٹیننٹ تھا۔ ایک بار چھٹی پر گھر آیا تو انہوں نے سب سے الگ کر کے میری تنخواہ پوچھی۔ ظاہر ہے ان کے اندازے سے خاصی کم نکلی۔ ''اس سے زیادہ تو میں بجلی کا بل دیتا ہوں''۔ انہوں نے خلوص دل سے مجھے مشورہ دیا کہ فوج کی نوکری چھوڑ کر اپنے کارخانے آ جاؤں۔ ''غیر کی نوکری سے اپنا کاروبار ہزار درجے بہتر ہے۔'' میں نے نرمی سے ان کا مشورہ اِدھر اُدھر کر دیا۔ دوسری بار جب میں کیپٹن تھا، انہوں نے یہی مطالبہ دہرایا۔ تب تک میں آرمی میں اچھا خاصا ایڈجسٹ ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی کتابوں کا رسیا اور علم و ادب کا شوقین تھا ایک عجیب سی عینیت پسندی کا مجھ پر غلبہ تھا۔ فیکٹری، مزدور، حساب کتاب سے دلچسپی نہیں، روپیہ پیسہ اور جائیداد کو میں پرِ کاہ کے برابر اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے ملائمت سے کہا ''جتنا پیسہ زندگی گزارنے کو درکار ہوتا ہے وہ مجھے فوج سے مل جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ میں اپنا لکھنے پڑھنے کا شوق بھی جاری رکھ لیتا ہوں۔ آپ میری نوکری کو چلنے دیں۔'' وہ مان گئے

کارگل کی جنگ اور بعد ازاں سیاچن گلیشیر پر میری ڈیوٹی کے دنوں میں وہ خاصے مضطرب رہے۔ وہ پوری خبریں سنتے تھے۔ بعد میں انہیں تسلی سی ہوگئی۔ لائن آف کنٹرول اور وزیرستان کی تعیناتی کے دوران میں وہ خط، ٹیلی فون اور دعاؤں پر بھروسے کے سبب وہ اطمینان میں رہے۔

میری کپتانی کے دن تھے اور پوسٹنگ لاہور میں تھی۔ یہی وہ شہر تھا جہاں وہ آسانی سے ملنے آ جاتے تھے۔ ایک بار وہ آئے ہوئے تھے۔ شام کو باہر نکلے تو آفیسرز کالونی کی سڑکوں پر بچے سائیکلیں چلا رہے تھے۔ اُسی وقت مجھے پیسے دیے۔ میں نیلا گنبد سے سائیکلیں لے آیا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے پوتے اور پوتی کو سائیکل چلاتے دیکھا اور پھر واپس روانہ ہوئے۔

ابو کی زندگی کے فارمولے بہت سادہ تھے۔

پہلے نمبر پر وہ مالی آسودگی کو اہمیت دیتے تھے۔ دیانت اور محنت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا اور کاروبار کو ترقی دینا ان کی زندگی کا بڑا محور تھا۔ وہ سچائی کیساتھ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں عزت اور سہولت کے ساتھ رہنا ہے تو مالی حیثیت مستحکم کرو۔ وہی بات پنجابی کہاوت والی جیہدے گھر دانے اوہدے کملے وی سیانے (جس کے گھر روپیہ پیسہ اس کے بے وقوف بھی سمجھ دار)۔ میں اُس وقت تو ان سے اتفاق نہیں کرتا تھا، اب زمانے کے چلن نے خوب اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ وہ ٹھیک کہتے تھے۔

دوسرے نمبر پر ان کی مذہبی و مسلکی وابستگی تھی۔ وہ خالص حنفی بریلوی ہونے کو وجہ نجات سمجھتے تھے۔ نعت خوانی کی محفلوں میں جانا اور نعت خوانوں پر پیسے لُٹانا انہیں مرغوب تھا۔ اس کے علاوہ دنگل دیکھنا کشتی جیتنے والا پہلوان پنجابی ریت کے مطابق تماشائیوں کے آگے سے گزرتا تو اس کی مُٹھی میں پیسے ضرور تھماتے۔ گھر آ کر دنگل کی قابلِ ذکر کشتیوں کا احوال جوش و خروش سے سناتے۔ ساتھ ساتھ داؤ پیچ پر فارم کر کے بتاتے۔

ابو جی پرانی وضع کے خالص انسان تھے۔ چالاکی اور بناوٹ انہیں چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ ناپسندیدگی کا فوراً اور برملا اظہار کر دیتے۔ منہ پر بات کرتے چاہے رشتے داری میں دراڑ ہی کیوں نہ آ جائے۔ بینک کی منافع بخش سکیموں میں پیسہ رکھوانا ناجائز سمجھتے۔

نیلامی والی کمیٹی کو حرام سمجھتے۔ قرضِ حسنہ کے سچے دل سے قائل تھے۔ اور فراخ دلی سے لوگوں کو قرض دیے۔ بھکاریوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اور انہیں کاہل سمجھتے تھے تاہم بزرگ اور خواتین سائلین کو خیرات دے دیا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کے معاملے میں بے حد حساس تھے۔ پورا پورا حساب کر کے ہر سال زکوٰۃ دیتے۔

فلموں اور گانوں سے لگاؤ نہیں تھا۔ سوائے نصرت فتح علی خاں اور ریشماں۔ فارغ وقت نماز، تلاوت اور گپ شپ میں گزارتے تھے۔ امی کی وفات کے بعد انہیں کچھ قوالیاں اور گیت بار بار سنتے اور روتے ہم نے دیکھا۔

ابو جی کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ اور حادثہ

امی کی اچانک وفات تھا۔ جولائی 1998ء کی ایک صبح امی حسبِ معمول تڑکے بیدار ہوئیں۔ فجر کی نماز پڑھتے ہوئے جائے نماز پر ہی گر کر بے ہوش ہوگئیں۔ انہیں فوراً سی ایم ایچ گوجرانوالہ لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ دماغ کی نس پھٹ گئی ہے۔ بے ہوشی کے عالم میں ہی چند گھنٹے میں ان کا انتقال ہوگیا۔

امی کی وفات پر ابو زار و قطار روئے۔ حالانکہ دیہات کی معاشرت میں بیوی کی وفات پر شوہر کا اونچی آواز میں رونا قدرے معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن ہم نے دیکھا کہ ابو، امی کا نام لے لے کر بے اختیار روئے جا رہے تھے۔

اس وقت ابو کی عمر محض 50 سال تھی۔ ہماری سب سے چھوٹی بہن بارہ تیرہ برس کی تھی۔ (ہم سات بہن بھائی ہیں) ابو کو نارمل روٹین میں آتے آتے کئی ماہ لگ گئے پھر بھی کئی بار اچانک رو پڑتے۔ کاروبار کے علاوہ ان کی کوئی خاص سرگرمی تھی نہیں۔ گھر، فیکٹری اور مسجد اس تکون میں ان کی اداس زندگی گزرنے لگی۔ ایک آدھ سال بعد میں نے بڑی بہن اور چھوٹے بھائی سے بات کی کہ ہمیں ابو کی شادی کر دینی چاہئے۔ وہ پہلے تو ہکا بکا رہ گئے پھر انہوں نے کہا کہ باقی بہن بھائیوں کے سامنے یہ تجویز رکھی جائے لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد۔ میرا خیال ہے کہ امی کی وفات کے دو تین سال بعد کثرتِ رائے سے تجویز منظور ہوئی (سب سے چھوٹی بہن نے تجویز سے اختلاف کیا)۔ ابو سے بات کرنے کی بھاری ذمہ داری میرے اور شہباز (چھوٹا بھائی) کے کندھوں پر آ پڑی۔

یہ بات سنتے ہی ابو زار و قطار رونے لگے۔ ہم دونوں بھائیوں کے آنسو بھی گریبان تر کرتے رہے گریہ وزاری میں کوئی بات ہی نہ ہو سکی۔ دو چار ماہ بعد ہم نے دوبارہ بات کی تو انہوں نے سوچنے کا وقت مانگا۔ چھ آٹھ ماہ سوچنے میں گزر گئے۔ بالآخر انہوں نے کہا "میری شرائط سن لو۔ نو جوان نہ ہو۔ میری عمر سے دو چار سال کم زیادہ ہو۔ کنواری نہ ہو، بیوہ یا مطلقہ ہو۔ بانجھ ہو یا بچہ پیدا کرنے کی عمر سے گزر چکی ہو۔ آخری شرط یہ کہ لازمی ہماری ارائیں برادری سے ہو۔ اگر رشتہ داروں میں سے کوئی ہو تو اور بھی اچھا۔

اتنی کڑی شرائط سن کر بھی ہم نے ہمت نہ ہاری اور دور و نزدیک چپکے چپکے خبر پھیلا دی۔ لوگ حیران بھی ہوتے تھے کہ اولاد خود اپنے باپ کا رشتہ تلاش کر رہی ہے لیکن ہم اپنا کام کرتے رہے۔ اسی کوشش میں ہمیں اپنی دور پار کی ایک رشتہ دار خاتون کا پتہ چلا۔ وہ ابو کی ہم عمر تھیں اور انہیں بچہ پیدا نہ کر سکنے کے باعث طلاق ہو چکی تھی۔ بات آگے بڑھانے سے قبل ابو کی رضا مندی لینی ضروری تھی۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے نام ابو کے سامنے رکھا۔ وہ روتے رہے اور سوچنے کا وقت مانگ لیا۔ حالانکہ وہ خاتون کو اچھی طرح جانتے تھے۔ تین ماہ بعد ابو نے ہاں کر دی۔ ہم خوش ہو گئے۔ ہم نے خاندان کے دو بزرگوں کا وفد تشکیل دیا اور انہیں رشتہ لینے روانہ کر دیا۔ جانے کیوں ہم سب بھائی بہنوں اور خود ابو کو یقین تھا کہ اُس طرف سے انکار نہیں ہوگا۔ لیکن بزرگوں کا وفد بے نیل مرام واپس آ گیا۔ ابو نے صرف اتنا پوچھا۔ "کیا آپ لوگوں نے الگ سے خاتون کے ساتھ بھی بات کی؟ انہوں نے بتایا کہ انکار خود انہوں نے ہی کیا ہے کیونکہ بھائیوں نے سارا معاملہ انہیں پر چھوڑ دیا تھا۔"

یہ انکار ابو کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گیا۔ وہ ٹوٹ پھوٹ گئے۔ شاید وہ زیادہ ہی حساس ہو چکے تھے۔ انہوں نے سختی سے ہمیں منع کر دیا کہ آج کے بعد یہ موضوع نہیں اٹھایا جائے گا۔

ہم نے ایک آدھ سال بعد ابو کے دوستوں اور بھائیوں کے ذریعے ایک اور کوشش کی جو ناکام ہوگئی ابو نے خود کو کاروباری معاملات اور عبادات کے سپرد کر دیا۔ میں آج بھی سمجھتا ہوں کہ اگر ان کی شادی ہو جاتی تو وہ نسبتاً بہتر زندگی گزارتے۔ خاص طور پر ان کے آخری پانچ سال تو ایسے تھے کہ قدم قدم پر مددگار، غمگسار ساتھی کی موجودگی ضروری تھی۔

فیکٹری سے واپسی پر وہ اپنے کمرے میں اگربتی سلگاتے، تلاوت کرتے، نوافل ادا کرتے۔ اس کے بعد نصرت فتح علی خاں کی قوالی "یاداں وچھڑے سجن دیاں آیاں، اکھیاں چوں نیر وسدا" سنتے رہتے، روتے رہتے اور سو جاتے۔

مذہب اور تصوف، اداسی اور تنہائی کے سہارے تھے۔ لیکن کامل سہارے نہ تھے! کامل سہارا کوئی جیتا جاگتا غم خوار انسان ہی ہوتا ہے یوں وہ صوفیا کے مزارات پر حاضری دیتے، کبھی مساجد میں تادیر بیٹھے رہتے۔ حتیٰ کہ دنگل اور بیساکھی کے میلے میں بھی جاتے لیکن اُداسی ان کے ساتھ ساتھ چلتی۔ زندگی کا ساتھی عجیب موڑ پر انہیں تنہا کر گیا تھا۔ ایک خوش شکل، خوش پوش اور خوش خوراک شخص کی باقی ماندہ جوانی تنہائی کے عذاب میں کٹتی رہی۔ ہم سب دیکھتے، آہیں بھرتے لیکن کچھ کر نہ سکتے تھے۔ شاید یہ ہماری کوتاہی تھی۔ ہمیں مزید کوشش کرنی چاہئے تھی۔

ابو ایک طاقتور اور دلیر شخص تھے۔ بوقت ضرورت لڑنے بھڑنے اور ہاتھ چلانے سے گریز نہ کرتے تھے۔ ان کے جسم پر دو بڑے زخموں کے نشانات تھے ایک خنجر کا اور دوسرا پستول کی گولی کا۔ خنجر کا زخم گردن سے ذرا نیچے کندھے پر تھا۔ اُس وقت ہم چھوٹے تھے اور وہ گاؤں کی کوئی لڑائی تھی۔ اتنے گہرے زخم کے باوجود جب وہ گھر آئے تو مکمل حوصلے میں تھے۔ گولی کا زخم ڈاکوؤں کے ساتھ مڈبھیڑ کی یادگار تھی۔ یہ 2004ء کا واقعہ ہے۔ ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ کے مکان میں ہماری رہائش تھی۔ ڈاکو

بیرونی دیوار پھلانگ کر گیراج میں چھپے ہوئے تھے۔ ابو حسب عادت فجر سے پہلے بیدار ہوئے۔ مسجد جانے کے لئے گیراج میں آئے ہی تھے کہ دو ڈاکوؤں نے انہیں گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ وہ ابو کو واپس رہائشی حصے میں لے جانا چاہتے تھے۔ تاکہ اہل خانہ کو یرغمال بنا کر لُوٹ مار کریں۔ ابو جی خوف زدہ ہوئے بغیر ان پر پل پڑے اور تھپڑوں، لاتوں، مُکوں کی بارش کر دی۔ ایک ڈاکو نے گولی چلائی جو کندھے سے ذرا نیچے لگ کر آر پار ہو گئی۔ گولی لگنے کے بعد بھی ابو ان کو پکڑنے اور جکڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ ایک ڈاکو کی جیکٹ ابو کے ہاتھ میں رہ گئی اور ڈاکو بھاگ گئے۔ اسی جیکٹ کی مدد سے ان کی شناخت ہوئی اور وہ گرفتار ہوئے۔

ڈاکوؤں کے فرار کے بعد ابو سکون سے اندر آئے اور بھائی سے کہا: ''مجھے ہسپتال لے چلو، گولی لگ گئی ہے۔'' اتنے سکون سے کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

عمر کے آخری برسوں میں ان پر کئی بیماریاں حملہ آور ہوئیں۔ جگر کا کچھ مسئلہ ہوا تو کہنے لگے۔ کچھ فکر نہ کرو۔ جو بندہ محنت مشقت کا عادی ہو اُسے ستے ای خیراں''۔ ذیابیطس ہو گئی تو ہم سب پریشان ہوئے لیکن وہ پرسکون تھے۔ میٹھا انہیں مرغوب تھا۔ بہو سے کہتے ''میری چائے پھیکی رکھنا'' کچھ دیر بعد ہی فریج سے گلاب جامن نکال کر کھاتے ''پکڑے'' جاتے!

پھر ہم نے دیکھا کہ ان کا کسرتی، ورزشی، مشقتی جسم رفتہ رفتہ گھلنے لگا۔ پھر ان کو پراسٹیٹ غدود کا مسئلہ بن گیا۔ اس کا دوبار آپریشن ہوا۔ دونوں بار آپریشن سی ایم ایچ میں ہوئے اور میں پاس تھا۔ وہ آپریشن تھیٹر جانے سے پہلے اپنی گھڑی اتارتے، قمیص اور بٹوا میرے حوالے کرتے اور درود شریف پڑھتے ہوئے۔ آپریشن تھیٹر میں چلے جاتے۔ ذرہ برابر خوف یا گھبراہٹ میں نے ان کی آنکھوں میں نہیں دیکھی۔ البتہ فالج سے وہ پریشان ہوئے۔ انہیں یہ قبول کرنے میں کئی ماہ لگ گئے کہ میرا بازو اور ٹانگ اب میری بات نہیں مانتے۔ خاصے رنجیدہ و دل شکستہ ہو گئے۔ وہ چلتے پھرتے صحت مند تھے۔ بستر سے لگے تو کمزور ہوتے چلے گئے۔

ابو جی نے زندگی میں ہی زیادہ تر اثاثے اپنی منشا کے مطابق اپنی اولاد میں تقسیم کئے۔ وہ خاندان کے پہلے صاحبِ ثروت فرد تھے۔ جنہوں نے بیٹیوں کو بھی مکمل شرعی حصہ دیا۔ اس کے علاوہ ایک مدرسہ قائم کیا جہاں بچیوں کو دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس مدرسے کے جملہ اخراجات وہ خود برداشت کرتے تھے۔ ان کے بعد یہ صدقہ جاریہ ان کی اولاد جاری رکھے ہوئے ہے کئی مساجد میں ماہانہ عطیات اور مساکین کے مستقل وظائف انہوں نے جاری کئے ہوئے تھے۔

کبھی کبھی ابو جی ہم سب بہن بھائیوں کو پاس بٹھا کر اپنی زندگی کا تجربہ، نکاتِ دانش کی شکل میں دان کرتے تھے۔ چند موتی ملاحظہ ہوں۔

- جولڑکا دوستوں میں بیٹھ کر باپ کی شکایتیں کرے وہ خاندانی نہیں ہوتا۔ اس طرح جو لڑکی پڑوسن کے سامنے ماں کی برائی کرے وہ گھر کی وفادار نہیں۔
- جو شخص بات کرتے ہوئے بات بے بات ہنستا رہے وہ دانش مند نہیں ہوتا۔
- ماں سے بڑھ کر پیار جتلانے والی کٹنی ہوتی ہے۔

امی کی طرح ابو کو بھی بے شمار پنجابی اکھان (اقوال) یاد تھے جنہیں وہ موقع محل کی مناسبت سے گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔ سلطان باہو اور بلھے شاہ کے اشعار، ہیر وارث شاہ کے کچھ حصے، بے شمار اردو پنجابی نعتیں اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی کا مقبول زمانہ سلام، مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' انہیں یاد تھا۔ سیاست کی خبروں سے انہیں چڑ تھی۔ کہتے ''یہ سارے ایک جیسے ہی ہیں۔'' جرائم کی خبریں افسوس آمیز توجہ سے سنتے تھے۔

آخری دو سال ان کی صحت زیادہ خراب رہی۔ پھر بھی وہ اکثر اوقات اپنی قائم کردہ ''ریاست'' یعنی فیکٹری میں جاتے۔ فخر سے دفتر میں بیٹھتے۔ سائلوں کو خیرات دیتے۔ کبھی دفتر سے اٹھ کر ورکشاپ میں کاری گروں کے پاس چلے جاتے۔ ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔ اپنی ''ایجاد کردہ'' مشینوں کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔ دراصل انہوں نے اپنی ذاتی اُپج اور قوتِ تخلیق سے کئی مشینوں میں تبدیلیاں کی تھیں، کچھ آلات اور اوزار خود بنائے تھے جنہیں وہ ''جگاڑ'' (Innovation) کہتے تھے۔ ان کے اندر چھوٹا موٹا مکینیکل انجینئر تھا۔ کوئی مشین خراب ہوتی تو اُسے خود ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے۔ معمولی پڑھا لکھا ہونے کے باوجود ورنیر کیلیپر اور مائیکرومیٹر کی مدد سے باریک سے باریک پیمائش کر سکتے تھے۔ الیکٹرک موٹر کی محض آواز سن کر اس کا نقص بتا دیتے تھے۔

انہوں نے زندگی کو صفر سے شروع کر کے کروڑوں تک پہنچایا تھا۔ انہیں اس بات کا اچھا خاصا احساس تھا۔ وہ بات بے بات یہ ذکر کر کے اپنی تعریف سننے کے متمنی رہتے۔ ہم بھی ان کی دل کھول کر تعریف کرتے جس پر وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے اور مسکراتے رہتے۔

کسی دن طبیعت خراب ہوتی تو کہتے مجھے کارخانے لے چلو، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کبھی کہتے مجھے فلاں پلاٹ دکھا لاؤ۔ فلاں جائیداد پر لے جاؤ۔ اپنی فتوحات اور کامیابیوں کی مسرت کسے نہیں ہوتی؟ واپسی پر کسی نہ کسی مسجد میں نماز ادا کرتے، شکرانے کے نوافل پڑھتے۔ کبھی قبرستان جاتے، ماں، بیوی اور باپ، دادا کی قبروں پر تلاوت کرتے۔ پھر گاؤں کی اس قدیمی مسجد میں بیٹھے رہتے جہاں بچپن میں جایا کرتے تھے۔

وفات سے چھ آٹھ ماہ قبل ہم نے محسوس کیا کہ ان کی یادداشت متاثر ہونے لگی ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا وہ ڈیمنشیا (Dementia) کا شکار ہو رہے تھے۔ ان کی گفتگو بے ربط ہوتی گئی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھولنے لگے۔ رفتہ رفتہ زندگی بھر کی عادت، سگریٹ نوشی، بھی فراموش ہو گئی۔ یوں ہوتا کہ ایک پل وہ بالکل درست بات کرتے۔ اگلے ہی لمحے ماضی کے دور دراز سفر پر نکل جاتے۔ بچپن کے دوستوں کے نام لیتے۔ کھیتوں، گلیوں کا ذکر کرتے۔ کبھی فوت شدگان کو یاد کرتے کہ ابھی مجھ سے مل کر گئے ہیں۔ دراصل وہ اپنے بچپن میں چلے گئے تھے۔ کسی وقت تو انہیں بھول ہی جاتا کہ وہ شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کا ایسے تذکرہ کرتے جیسے وہ بچے ہوں۔ کبھی اس زمانے سے دس پندرہ برس آگے آجاتے۔ کہتے ہیں کہ گزری زندگی کا ایک ایک پل ذہن انسانی میں محفوظ ہوتا ہے۔ بس وہ بیتے پلوں کو پھر سے جی رہے تھے۔

جو شخص زندگی بھر صاحب ارادہ و عمل رہا ہو، جسے ہم نے ہمیشہ طاقت و اختیار سے لیس دیکھا ہو، اسے یوں بے دست و پا اور بے ربط دیکھنا اذیت ناک مرحلہ تھا۔ ایک دن تو دل چیر دینے والا واقعہ ہوا۔ میں پاس بیٹھا ان کی ٹانگ دبا رہا تھا کہ اچانک بولے ''ماں سے مل آئے ہو؟'' میں اس بات کا کیا جواب دیتا، بس یہ ہوا کہ آنسو اندر گرنے لگے۔ ماں کو مرے ہوئے تو بائیس سال ہو چکے تھے۔ ان کی ذہنی حالت کا ادراک کرتے ہوئے میں نے کہہ دیا ''جی ابو جی، امی سے مل آیا ہوں۔'' درد بھرے لہجے کہنے لگے ''اسے کہنا اگر مجھ سے ناراض ہے تو ناراض رہے، میری خیر ہے، بچوں سے تو ملتی رہے۔''

میری تو چیخیں نکل گئیں۔ ابو جی کو ان کے ذہن نے سمجھا دیا تھا کہ امی ان سے ناراض ہو کر کہیں اور رہتی ہیں اور ان سے ملنے نہیں آتیں۔

تئیس سال کی تنہا، مجرد زندگی اور رگ رگ میں گھلتے ہجر نے ان کے تصورات کو کن پر چھائیوں کی شکل دے دی تھی۔ میں ان کے ہاتھ چومتا جاتا اور روتا جاتا تھا۔ وہ ایک بے نیاز خاموشی اور بے نام حیرت سے مجھے دیکھتے جاتے تھے۔

مائے نی مائے میرے گیتاں دے نیناں وچ
برہوں دی رڑک پوے۔ ادھی ادھی راتیں اُٹھ رون
موئے متراں نوں، مائے سانوں نیند نہ پوے آخری
دنوں میں وہ خالی خالی نظروں سے چھت کو تکتے رہتے تھے۔ پوتوں، پوتیوں اور نواسوں، نواسیوں کو کبھی پہچان لیتے اور کبھی ایک ٹک دیکھتے جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کوئی بیٹا یا بیٹی سامنے آتی تو کسی وقت فوراً نام لے لیتے اور کسی وقت اجنبیت سے تکتے رہتے۔ ایسے میں اشکوں کی جھڑیاں لگ جاتیں۔ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو سی ایم ایچ گوجرانوالہ میں منتقل کر دیے گئے۔ جہاں وہ تین دن آکسیجن کے سہارے زندہ رہے اور تین اپریل 2021ء کی صبح خاموشی سے انتقال کر گئے۔

وہ اپنی وفات سے کئی ماہ قبل اس دن کا ذکر کرتے بلکہ ہدایات دیتے رہے تھے۔ کہتے تھے میں فوت ہو جاؤں تو مجھے فلاں طریقے سے فلاں جگہ رکھنا۔ وہی کفن دینا جو میں مدینہ پاک سے لایا ہوں۔ فلاں عالمِ دین میرا جنازہ پڑھائے اور کچھ بھی ہو جائے، مجھے میرے گاؤں گوندلانوالہ کے قبرستان میں دفن کرنا۔ میں وہیں کی مٹی ہوں۔ اس مٹی میں ملانا۔

اب ان کی قبر پہ جاتا ہوں تو وہ ساری باتیں زندہ ہونے لگتی ہیں جو عمر بھر ہم ان سے سنا کیے۔ ساتھ ہی کانوں میں باپ کی لاش پر بیٹیوں کے بین بلند ہوتے ہیں اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔

عتیق الرحمٰن صفی/ گجرات

لمحہ لمحہ زوال ہوگا
درد سہنا محال ہوگا
لوٹ آتے ہیں جانے والے
خام تیرا خیال ہوگا
اب کے ٹوٹا ہے مان ایسا
پھر کبھی نہ بحال ہوگا
اب بھی بدلے ہیں صرف ہندسے
پہلے جیسا ہی سال ہوگا
حالِ دل مت کسی سے کہنا
بعد میں پھر ملال ہوگا
مر ہی جائیں گے ہجر میں ہم
جی لیا تو کمال ہوگا
آج فرقت ہے اک حقیقت
روزِ محشر وصال ہوگا

خادم علی انجم/ لاہور

حسن کو ڈھلتے دیکھا ہے
وقت کو چلتے دیکھا ہے
سب کچھ ہی کھو جاتا ہے
ہاتھ کو ملتے دیکھا ہے
دیوانوں کی آنکھوں سے
چاند نکلتے دیکھا ہے
دُنیا کا ایمان یہاں
زر سے پھسلتے دیکھا ہے
انجم حسن کے گرگٹ کو
رنگ بدلتے دیکھا ہے

بقیہ انٹرویو: انور شعورؔ

ارژنگ: سب سے پہلے اپنے ادبی وسوانحی پس منظر سے آگاہی دیجیے۔

انور شعورؔ: آبائی تعلق فرخ آباد کے یوسف زئی خاندان سے ہے۔ ولادت 11 اپریل 1943ء کو غالباً سیونی میں ہوئی۔ یہ بھارتی صوبے مدھیہ پردیش کا ایک شہر ہے۔ 1947ء میں ہم لوگ پاکستان بنتے ہی بمبئی سے کراچی آ گئے۔ کراچی اور میں ساتھ ساتھ بڑے ہوئے ہیں۔ یعنی بچپن کے دوست ہیں۔ شروع میں کچھ عرصے بوہرہ پور کے علاقے میں قیام کیا۔ پھر نظام آباد کی بنیاد پڑی تو ہم وہاں منتقل ہو گئے۔ کھیل کود (اور شرارتوں) کا زمانہ ناظم آباد ہی میں گزرا۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ والد صاحب کے ساتھ نماز کے لیے مسجد جانا ہوتا تھا۔ وہاں نعت (نعت خوانی کی) محفلیں ہوتی تھیں۔ ان میں شرکت کے باعث مجھے بھی نعت خوانی کا شوق ہو گیا۔

اس شوق میں اردو اور فارسی کی بے شمار نعتیں یاد کرنے کا موقع ملا۔ اس لیے طبیعت خود بخود یعنی خواہ مخواہ موزوں ہو گئی اور میں تک بندی کرنے لگا۔ بچوں کے تقریباً تمام رسالے نظر سے گزرتے تھے۔ حمد و نعت کے علاوہ بچوں کی نظمیں بھی مجھ سے سرزد ہونے لگیں اور یہ ''کلام'' بچوں کے پرچوں میں تواتر سے چھپنے بھی لگا۔ اُن دنوں میرا شاعرانہ نام انور افسری تھا۔ ویسے اعلیٰ نام انوار حسین ہے۔ افسر میرے استاد کا نام تھا، اُن کی نسبت سے میں خود کو افسری لکھتا تھا۔ بعد میں یہ نام بدلنا پڑا۔ دوست مذاق اُڑاتے تھے کہ افسری تو نسوانی نام ہوتا ہے۔ بات صحیح تھی اس لیے میں افسری کے بجائے افسر بن گیا۔ پھر شعورؔ تخلص رکھا تو انور افسر شعورؔ ہو گیا۔ اس کے علاوہ کچھ دنوں شعورؔ انور کے نام سے بھی لکھا۔ میں نے تین اُستادوں سے شاعری پر اصلاح لی۔ مولانا اختر صابری، حضرت تابش دہلوی اور حضرت سراج الدین ظفرؔ ان کے علاوہ بے شمار لوگوں سے فیض اُٹھایا اور سب سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ادبی دنیا کے لاتعداد مشاہیر نہ صرف دیکھے، بلکہ اکثر سے نیازمندی بھی رہی۔

ارژنگ: عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

انور شعورؔ: عملی زندگی تو خیر کیا۔ ہاں بے عملی کا آغاز ہوش سنبھالتے ہی ہو گیا تھا۔

کوئی پوچھے کہ کیا کرتے ہو دن بھر
تو ہم خاموش ہو جاتے ہیں ہنس کر

لکھنے لکھانے کا شوق کارِ بیکاراں سمجھا جاتا تھا اور سمجھا جاتا ہے۔ ادیب و شاعر سے تعارف کے وقت عموماً یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ اور کیا کرتے ہیں؟ یہ سوال ڈاکٹر، وکیل یا پروفیسر سے نہیں کیا جاتا۔ بہرحال اسی کارِ بیکاراں سے میری گزر اوقات ہوتی تھی۔ چھوٹے موٹے ناشرین کے لیے چالو قسم کی کہانیاں گھسیٹنے کے علاوہ اخبارات اور ریڈیو وغیرہ کے لیے بھی کچھ لکھ لکھا لیتا تھا۔ کم عمری میں کسب معاش کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ میں بہ وجوہ یا بے وجہ بچپن میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

نہ پوچھ کیسے گزرتی ہے زندگی اے دوست
بڑی طویل کہانی ہے، پھر کبھی اے دوست

(صادق القادری)

ایک شعر سنئے یہ دربدری کے اسی زمانے میں کہا تھا۔

بازاروں میں پھرتے پھرتے دن بھی بیت گیا
کاش ہمارا بھی گھر ہوتا، گھر جاتے ہم بھی

چار اداروں، انجمن ترقی اردو، ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں'' ماہنامہ ''سب رنگ'' ڈائجسٹ اور روزنامہ ''جنگ'' سے باقاعدہ معاشی وابستگی رہی۔ ''جنگ'' میں قطعہ نویسی آج بھی جاری ہے۔

ارژنگ: پہلا شعر کب کہا؟ کچھ یاد ہے؟ ادب سے شوق کی ابتدا؟

انور شعورؔ: پہلا شعر تو یاد نہیں رہا ''شاعری'' گیارہ بارہ سال کی عمر سے شروع ہو گئی تھی۔ لڑکپن کے اشعار ذہن میں رہ گئے ہیں۔

کوئی راہ اپنے لیے ڈھونڈ لوں گا
ہر اک راہ پر گام دو گام چل کے

.....

خلد میں کیوں مے پلائی جائے گی
کیا وہاں بھی گردشِ ایام ہے

.....

نام ہی سن کر مجھے ان سے محبت ہو گئی
رفتہ رفتہ اک فسانہ بن گئی چھوٹی سی بات

.....

دیکھے گا کون اب مرا چہرہ جلا ہوا
میں اک دیا ضرور ہوں لیکن بجھا ہوا

.....

کسی نے کہا کہ نالہ دل میں اثر نہیں
جس جس نے سن لیا وہ مرا ہم نوا ہوا

.....

آواز دے مجھے کہ گزر آؤں راہ سے
ہر شے پہ سرسری سی نظر ڈالتا ہوا
ہم تو اسی چمن کے خزاں دیدہ پھول ہیں
اے اجنبی بہار! ہمیں اجنبی نہ جان

.....

اسی حال میں بنا لوں کہیں اپنا آشیانہ
نہ ٹھہر سکے گی شاید کبھی گردشِ زمانہ

ارژنگ: اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیے؟

انور شعور: غزلوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے۔

(۱) اندوختہ 1995ء (۲) مشقِ سخن 1949ء (۳) می رقصم 2006ء (۴) دل کا کیا رنگ کروں 2014ء (۵) آتے ہیں غیب سے 2017۔ پہلے چار مجموعوں پر مشتمل کلیاتِ انور شعور اور پانچواں مجموعہ رنگ ادب پبلی کیشنز، اردو بازار کراچی سے شائع ہوا ہے۔

کسی نے کہا تھا:

ماتم کی انجمن ہو کہ بزمِ نشاط ہو
شامل ہیں ایک ادائے کنارہ کشی سے ہم

ارژنگ: کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصّہ رہے ہیں؟

انور شعور: کسی تحریک میں باقاعدہ حصّہ نہیں لیا۔ ہر حلقے سے برابر کے تعلقات رہے۔ یہ کبھی نہیں دیکھا کہ کون دائیں ہے، کون بائیں یعنی عرفِ عام میں کون رجعت پرست ہے کون ترقی پسند۔ جس سے بھی جو کچھ حاصل ہوا، مومن کی گمشدہ میراث کی طرح شکریے کے ساتھ قبول کرلیا۔

کچھ نہ کچھ سچائی ہوتی ہے نہاں ہر بات میں
کہنے والے ٹھیک کہتے ہیں سبھی اپنی جگہ

ارژنگ: کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جارہا ہے؟

انور شعور: اپنی قوم صاحبِ کتاب ضرور ہے، مجموعی طور پر کتاب خواں نہیں ہے۔ کتاب سے جتنی دوری برقی ذرائع ابلاغ آنے سے پہلے تھی اتنی ہی آج بھی ہوگی۔ برقی ذریعہ ابلاغ سے پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کتاب ہی کا نعم البدل ہے۔ کتاب نے ہمیں جو علم دیا تھا اُسی سے ہم اس انتہائی کارآمد مفلوج اور حیرت انگیز ایجاد تک پہنچے ہیں۔ پرانی چیز کو نئی چیز کے لیے بہ رضا و رغبت جگہ خالی کر دینا چاہیے۔ سنا ہے وزیر آغا مرحوم نے کہا تھا کہ پچیس سال بعد کتاب ختم ہو جائے گی۔ گویا:

جا رہی ہیں کتب عجائب گھر
مر رہا ہے کتاب کا قاری

لیکن خوشی کی بات ہے کہ آغا صاحب کا اندازہ غلط نکلا۔ مطالعے کا رواج آج بھی ختم نہیں ہوا ہے۔ کتاب خوب چھپ رہی ہیں، خوب بک رہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا پھل ناشر اکیلا چٹ کر جاتا ہے۔ افسوس! ڈاکوؤں جتنا اخلاق بھی نہیں ہے کہ ایمانداری سے مل جل کر کھاؤ۔ ویسے سب ناشر ایسے نہیں ہیں مستثنیات بھی ہیں۔ ایک بار ویلکم بک پورٹ کراچی میں منیر نیازی نے پروفیسر سحر انصاری اور ڈاکٹر فاطمہ حسن کے سامنے کہا تھا کہ کوئی پبلشر غریب نہیں ہوتا۔

ارژنگ: کیا اہلِ قلم کو سیاست میں حصّہ لینا چاہیے؟

انور شعور: کہیں پڑھا تھا کہ کوئی پاکستانی ادیب فرانس میں سارتر سے ملے تو سارتر نے ان سے کوئی سیاسی سوال کیا۔ موصوف نے جواب دیا کہ ہم تو قلمکار ہیں، ہمارا سیاست سے کیا تعلق؟ یہ سنتے سارتر نے الوداعی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ کوئی شخص سیاست میں حصّہ لے یا نہ لے، سیاست اُس پر اثر انداز ضرور ہوتی ہے۔ آج کل وطنِ عزیز کی سیاست کچھ اور ہو کے رہ گئی ہے۔ اس کچھ اور نے اسے مخلصانہ سرگرمی کے بجائے مجرمانہ سرگرمی بنا دیا ہے۔ پھر بھی ادیبوں کے علاوہ دوسرے اہل اور حق دار لوگوں کو ہی سیاست میں حصّہ لینا چاہیے۔ ماحول خراب سہی، ہر شخص کو اپنے حصّے کی شمع ضرور جلانا چاہیے۔ برے لوگوں کے لیے میدان خالی کیوں چھوڑا جائے۔ ویسے لکھنے والے چاہے عملاً سیاست نہ کریں، اپنی تحریروں کے ذریعے وہ یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔

ارژنگ: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

انور شعور: تخلیقیت کا لفظ استعمال کر کے آپ شاید یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تخلیق کیا ہے؟ یہاں جواباً میں ایک سوال کا ذکر کروں گا۔ کیونکہ سوال یہ ہے کہ کیا آپ سگریٹ پیتے ہیں؟ اس سوال کے عموماً دو جواب دیے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ دوسرا یہ کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔ دونوں جوابات صحیح ہیں لیکن پہلا جواب سیدھا سادہ بیانیہ ہے۔ دوسرا جواب تخلیقی ہے۔ اب ایک مزے کی بات سنئے۔ میں نے ایک بار احمد ندیم قاسمی مرحوم سے پوچھا کہ آپ شراب کیوں نہیں پیتے؟ انھوں نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چپ ہوگیا۔ معقول جواب تھا۔ یہی سوال میں نے بعد میں کراچی کے نقاد اور شاعر قمر جمیل سے کیا کہ آپ شراب کیوں نہیں پیتے؟ انھوں نے بے ساختہ کہا میرا نشہ ٹوٹ جائے گا۔ اس جواب پر میں جھوم گیا۔ کیسا عمدہ تخلیقی جواب ہے۔

اچھا تخلیق کار غالباً وہ ہوتا ہے جو اپنا خیال سچائی اور تازگی سے پراثر پیرائے میں پیش کرنے پر قادر ہو۔ نیز دیگر خوبیوں کے علاوہ ادب کا دلچسپ ہونا بھی ضروری ہے اور فنی نقائص سے پاک ہونا بھی۔

ارژنگ: آپ کی زندگی کا کوئی یادگار مشاعرہ؟

انور شعور: مشاعرے عموماً یاد نہیں رہتے۔ رات گئی، بات گئی۔ ہاں ایک مشاعرہ آج بھی میں نہیں بھولا، کافی پہلے کی بات ہے۔ آرٹس کونسل میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ پیرزادہ قاسم نظامت کر رہے تھے۔ اچھے اچھے شاعر بیٹھے تھے۔ شاہدہ حسن بھی موجود تھیں۔ اپنی باری پر میں نے ایک غزل کے علاوہ یہ تین شعر بھی سنائے:

کیا بادلوں میں سفر زندگی بھر
زمیں پر بنایا نہ گھر زندگی بھر

سبھی زندگی کے مزے لوٹتے ہیں
نہ آیا ہمیں یہ ہنر زندگی بھر
محبت رہی چار دن زندگی میں
رہا چار دن کا اثر زندگی بھر

ہال بھرا ہوا تھا۔ میں تحت اللفظ پڑھ رہا تھا۔ سامعین ذوق وشوق سے سن رہے تھے۔ یکا یک مجمع میں ایک شخص جھومتا جھامتا اُٹھا اور جذب ومستی کے عالم میں تیزی سے گھوم گھوم کر حال کرنے لگا۔ اُسے اپنا بالکل ہوش نہیں تھا۔ مشاعرے میں یہ بالکل نئی بات تھی۔ مجمع حیران تھا۔

نہ چھیڑ آشفتگان شوق کو یہ بھی تو سوچ آخر
نہ جانے کون کس عالم میں کس دیوانہ پن سے ہے

ارژنگ: مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اُس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جارہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

انور شعورؔ: مشاعرہ اُردو تہذیب کی ایک منفرد اور مقبول سرگرمی ہے۔ اس میں سنانے والے اور سننے والے دونوں برابر کا حصّہ لیتے ہیں۔ ایک اچھا مشاعرہ شاعر کے کلام کے علاوہ سامعین کی داد بھی مانگتا ہے۔

داد ضرور دینی چاہیے۔ ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں جوش ملیح آبادی کسی بے تکے شعر پر زور زور سے داد دے رہے تھے۔ کسی نے سرگوشی میں پوچھا حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اُنھوں نے زیرلب جواب دیا منافقت۔

ایک اور واقعہ سنئے۔ کراچی کے ایک بڑے مشاعرے میں انڈیا کے مہمان شاعر خمار بارہ بنکوی غزل سنا رہے تھے۔ کوئی شعر سنانے کے بعد رک کر انھوں نے کہا کہ سامعین مجھے اپنا یہ شعر بہت عزیز ہے۔ مجمع سے آواز آئی۔ ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔

لوگ لوٹ پوٹ ہو گئے۔ یعنی داد ہی سے نہیں، اچھی ہوٹنگ سے بھی مشاعرے کا لطف دوبالا ہوتا ہے۔

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لای۔ قناعت و استغنا کے باعث بالعموم آسودگی ہی رہی۔ جو شخص کبھی بھوکا نہ سویا ہو اور جسے کبھی فٹ پاتھ پر رات نہ گزارنی پڑی ہو اُسے زمانہ محروم و مجبُور معاشرے میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنا چاہیے۔ ویسے بے چینی اور بے اطمینانی ہمیشہ ہر وقت رہتی ہے۔

یہ کشمکش الگ ہے کہ کسی کشمکش میں ہوں
آتا نہیں سمجھ میں بہت سوچتا ہوں میں

اس کے باوجود وقت اچھا ہی گزرتا ہے۔

قوی بھی ہے ضعیف بھی ہمارا حافظہ شعورؔ
مزے تمام یاد ہیں عذاب ایک بھی نہیں

ارژنگ: کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

انور شعورؔ: جہاں تک تخلیقی آسودگی کا معاملہ ہے جس زبان میں میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، اقبالؔ، فیضؔ اور دیگر قابل رشک شعرا موجود ہوں وہاں ہم جیسے کسی شمار قطار میں نہیں۔ مجھے اپنی کاوشوں پر کلی اطمینان کبھی نہیں ہوا۔ ہاں، جب اپنی دانست کوئی اچھا شعر کہہ لیا ہو تو سکون اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ شاید دنیا کا کوئی شاعر شرط باندھ کر اچھا شعر نہیں کہہ سکتا۔ شاعر صرف کوشش کر سکتا ہے۔ اچھا شعر ہو گیا تو ہو گیا ورنہ ٹائیں ٹائیں فش۔ منیر نیازی کہتے تھے کہ شاعری کی دیوی مجھ پر مہربان ہے۔ گویا اچھے شعر کے لیے ضروری ہے کہ شاعری کی دیوی مہربان ہو۔

قبول خاطر ولطف سخن خداداد است

تہذیبی علامات اور مظاہر میں ضرور تبدیلی ہوئی ہے لیکن غالباً شاعروں پر کوئی زوال نہیں آیا۔ معیاری اور غیر معیاری مشاعرے پہلے بھی ہوتے تھے، اب بھی ہوتے ہیں۔ جس طرح اداکار فلم یا ڈرامے سے منظر عام پر آتا ہے اسی طرح شاعر مشاعرے سے روشناس خلق ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ بعض شعرا مشاعروں کے بغیر بھی معروف و مقبول ہوتے ہیں۔ مثلاً اقبال، ابن انشا اور احمد مشتاق وغیرہ

اب شاعر کو داد وتحسین کے علاوہ معاوضہ بھی ملتا ہے۔ دنیا بھر کی سیر و سیاحت بھی نصیب ہوتی ہے۔ معاوضہ شاعری کی پیشکش کا ملتا ہے۔ شاعری کا نہیں، شاعری کا معاوضہ کیا ہو سکتا ہے اور کوئی کیا دے سکتا ہے۔ مانا کہ مشاعرہ ایک غیر نصابی سرگرمی ہے مگر بہت مزے دار، شگفتہ اور منفرد تفریح۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔ یہ زبان و ادب کے فروغ کا باعث بھی ہے۔ اگر اس میں کچھ خامیاں در آئی ہیں تو انھیں دور کیا جا سکتا۔

ارژنگ: کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

انور شعور: لکھنے کی تحریک کا منبع و ماخذ متعین نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی کلیہ نہیں ہے۔ یہ اپنی اپنی افتادِ طبع پر منحصر ہے۔ نیز ادب اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ اس لیے معاشرہ بنیادی عنصر ہے۔

نہ ہوں آنکھیں تو پیکر کچھ نہیں ہے
جو ہے باہر ہے، اندر کچھ نہیں ہے

ارژنگ: آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

انور شعورؔ: آپ چھری سے امرود بھی کاٹ سکتے ہیں، اُنگلی بھی۔ سوشل میڈیا کا کردار اُسے استعمال کرنے والے کی کارگزاری پر موقوف ہے۔

ارژنگ: ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

انور شعورؔ: فن کار کی شخصیت اُس کے مشاہدے اور تجربے فن پر پوری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ بیشتر لکھنے والے مختلف رنگ، مختلف فنکار کی ذات فن پر کس

قدر اثر ڈالتی ہے اُسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ فیض نے اقبال پر جو نظم لکھی ہے۔

ع آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر

یہ نظم شاید اقبال سے زیادہ خود فیض پر صادق آتی ہے۔ اسی طرح صادقین کی اکثر تصویروں میں اُس کی اپنی جسمانی ہیئت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ارژنگ: کیا کھویا کیا پایا؟

انور شعور: دنیا تو ایک مہمان خانہ ہے۔ ہے بہار باغِ دنیا چند روز یہاں سکندر بھی خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ جاتا ہے۔

جینے میں گھاٹا دیکھا نہیں کچھ
پایا ہی پایا، کھویا نہیں کچھ

.....

تھا کیا ہمارے پاس جو دیتے جہان کو
ہم نے تو بس کہا ہی کہا ہے جہان سے

ارژنگ: اردو زبان و ادب کا کیا مستقبل دیکھتے ہیں؟

انور شعور: اردو ہماری بے توجہی اور غفلت کے باوجود ہر طرف پھیل رہی ہے۔ اردو فلمیں کثرت سے بن رہی ہیں اور مقبول ہو رہی ہیں۔ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہم نے اردو کی تعلیم و ترویج پر خاطر خواہ توجہ نہیں رہی اس لیے اب زبان کی غلطیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ جیسے لوگوں میں غلط زبان بولنے کا کوئی مقابلہ جا رہی ہو۔ یہ صورتِ حال ختم ہونی چاہیے اس کے لیے ہم سب کو خصوصاً لکھنے والوں کو زبان کی صحت و اصلاح کے لیے آواز اُٹھانی چاہیے۔ زبان اظہارِ افسوس کافی نہیں، اس مقصد کے لیے اجتماعی جدوجہد کی اشد ضرورت ہے۔

اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا ہوں
اب میں اکثر میں نہیں رہتا، تم ہو جاتا ہوں

.....

ہر آنکھ والا روتا رہے گا
آخر یہ کب تک ہوتا رہے گا

.....

فرشتوں سے بھی اچھا میں برا ہونے سے پہلے تھا
وہ مجھ سے انتہائی خوش خفا ہونے سے پہلے تھا

.....

یہ خود کو دیکھتے رہنے کی ہے جو خو مجھ میں
چھپا ہوا ہے کہیں وہ شگفتہ رو مجھ میں

.....

یہ مت پوچھ کہ کیسا آدمی ہوں
کرو گے یاد ایسا آدمی ہوں

.....

کیا کریں، ہم جھوٹ کے عادی نہیں
اور سچ کہنے کی آزادی نہیں
اس تعلق میں کہاں ممکن طلاق
یہ محبت ہے، کوئی شادی نہیں

.....

وہ جب سے انکار کے بجائے مجسم اقرار ہو گئے ہیں
کچھ اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کچھ اور دشوار ہو گئے ہیں
نہ جانے کارِ جہاں بڑھا کر وہ قول کس دن نبھائیں گے
ہزار ہفتے گزر چکے ہیں، ہزار اتوار ہو گئے ہیں

.....

ملی نہیں ہے شرابِ طہور کچھ دن سے
بہت اُداس ہے انور شعور کچھ دن سے
یاد رکھ، گھر قفس نہیں ہوتا
میں یہاں اپنی رائے رکھوں گا
میری آنکھیں اُسے کھٹکتی ہیں
یہ دیے بھی بجھائے رکھوں گا

.....

میں بزمِ تصور میں اُسے لائے ہوئے تھا
جو ساتھ نہ آنے کی قسم کھائے ہوگا تھا
ہونے نہ دیا خود پہ مسلط اُسے میں نے
جس شخص کو جی جان سے اپنائے ہوئے تھا

.....

کیونکہ اب کوئی تعلق نہیں تیرا میرا
اس لیے شام ہے میری نہ سویرا میرا
نگرانی کی ضرورت نہیں اے دیدۂ دوست
اپنے اطراف بہت تنگ ہے گھیرا میرا

.....

رکھتا نہیں مصورِ فطرت نے موقلم
شہہ پارہ بن رہا ہے ابھی بن نہیں گیا
تھا وعدہ شام کا مگر آیا وہ رات کو
میں بھی کواڑ کھولنے فوراً نہیں گیا

.....

ہم نے بنا دیا ہے تمہیں ایک شاہکار
اب ہم تمہارے نام سے پہچانے جائیں گے
شاید ہمیں وہ بھول گئے ہوں غیاب میں
ہم اُن کے سامنے اُنھیں یاد آنے جائیں گے

.....

دیدہ ور! حسن کی تعریف سبھی کرتے ہیں
بات سب حسن میں ہے، دیدہ وری میں کیا ہے
میں نے یہ سوچ کے روکا نہیں جانے سے اُسے
بعد میں بھی یہی ہوتا تو ابھی میں کیا ہے

.....

صرف اُس کے ہونٹ کاغذ پر بنا دیتا ہوں میں
خود بنا لیتی ہے ہونٹوں پر ہنسی اپنی جگہ
دوست کہتا ہوں تمہیں شاعر نہیں کہتا شعور
دوستی اپنی جگہ ہے شاعری اپنی جگہ

مختصر ادبی خبریں (مرتبہ: محمد ممتاز راشد لاہوری)

وفیات:

❁ ممتاز ادیب اور مزاحیہ شاعری کا معتبر حوالہ سرفراز شاہد گزشتہ دنوں اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ مرحوم کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور انہوں نے زندگی بھر شعر و ادب سے اپنا تعلق بنائے رکھا۔ اس حوالے سے ملکی سطح پر نام کمایا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

❁ معروف ادیب و شاعر اور دانشور پروفیسر رئیس علوی دو دسمبر کو فوت ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

❁ 15 دسمبر کو ''جیو'' ٹی وی کے پروگرام ''خبرناک'' اور ''خبردار'' کے کردار پروفیسر بانی (عابد فاروق) فوت ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

❁ معروف اُردو/ پنجابی شاعر نصیر بلوچ سترہ دسمبر کو فوت ہوئے۔ تدفین تاندلیانوالہ میں ہوئی۔ وہ پروفیسر اصغر علی بلوچ کے سسر تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

❁ معروف نعت خواں خالد حسین خالد 18 دسمبر کو کراچی میں فوت ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اللہ ان کی روح کو آسودگی بخشے۔

ادبی رپورٹس:

❁ کل پاکستان محفل مشاعرہ مجلس ترقی ادب اور نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے زیر اہتمام 17 دسمبر کی شام ایوانِ قائداعظم لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ اس مشاعرہ میں ملک بھر سے نامور شعرائے کرام نے شرکت کی۔ صدارت ڈاکٹر اختر شمار جبکہ مہمانِ خصوصی وزیر ثقافت خیال احمد کاشرو تھے۔ نظامت کے فرائض ندیم بھابھہ نے نہایت خوب صورت انداز میں نبھائے۔ اس مشاعرے کی کامیابی کا سہرا ناظم مجلس ترقی ادب منصور آفاق کے سر ہے۔ وہ جب سے ادارہ میں آئے اُس کی ہر سطح پر ترقی اور نیک نامی کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔

❁ کارِ خیر گوجرانوالہ پاکستان تنظیم کے زیر اہتمام مقابلہ کتب ہوا جس میں ملکی اور غیر ملکی شاعروں ادیبوں نے بھرپور شرکت کی۔ 575 کتب میں سے 150 کتب کے شاعروں، ادیبوں، نثر نگاروں، سیرت نگاروں کو گولڈ میڈل، سلور میڈل، نقد انعام اور تحائف سے نواز کر عزت افزائی کی۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالماجد حمید المشرقی نے اس مرتبہ پھر ساری دنیا میں لکھنے والوں کی تحریروں کو سراہتے ہوئے خوب پذیرائی کر کے اُن کا حوصلہ بڑھایا۔ قلم کی روانی کو برقرار رکھنے کا وعدہ لیا۔ اُردو، پنجابی، سرائیکی، انگلش میں نمایاں پوزیشن ہولڈر لاہور سے تھے۔ جن میں ناز اوکاڑوی، چاک شاہ، انجینئر ظفر محی الدین، عبدالمجید چٹھہ، بشیر ناطق اور بابا سہوتہ ہیں۔ ان کے علاوہ لاہور سے 75 کے لگ بھگ قلمکاروں کو میڈلز سے نوازا گیا۔ تنظیم کارِ خیر پاکستان کا پروگرام ''مشرق سائنس کالج'' گوجرانوالہ میں ہوا۔ پروفیسر صائمہ زبیر مشرقی اور دبنگ سٹیج سیکرٹری عقیل شافی نے اپنی صلاحیت کے خوب جوہر دکھا کر سامعین سے داد وصول کی۔ 150 کتب میں سے 20 کتابیں مکتبہ شافی کی تھیں۔ اس طرح نستعلیق اور مکتبہ فجر، گلشن ادب پبلی کیشنز کی کتب کو بھی سراہا گیا۔

کارِ خیر کے کتب مقابلے میں شریف فیاض وزیر آبادی اور اُن کے بھائی قاری شوکت صاحب نے دوستوں کے لیے خوبصورت کلمہ شریف والی اعزازی تلواریں بھی تقسیم کیں۔ مشرقی برادران کے علاوہ لاہور سے عقیل شافی کو بھی اعزازی تلوار سے نوازا گیا۔ آخر میں ڈاکٹر عبدالماجد حمید المشرقی نے سب دوستوں کا شکریہ ادا کیا اور آئندہ پروگرام کے لیے جلد از جلد کتب بھیجنے کی گزارش بھی کی۔ تمام احباب کی چائے اور کھانے سے تواضع کر کے شکریے کے ساتھ رُخصت کیا۔

❁ 3 دسمبر کو اکادمی ادبیات اپر مال لاہور میں علی اصغر عباس کے اعزاز میں شام منعقد ہوئی۔ حسین مجروح، ممتاز راشد لاہوری، پروفیسر شفیق احمد خان، پروفیسر ناصر بشیر، توقیر بن اسلم، محمد جمیل اور دیگر مقررن شامل تھے۔

❁ 3 دسمبر کو پلاک لاہور میں پنجابی ادبی سنگت کا پنجابی مشاعرہ۔ صدارت: عدل منہاس لاہوری، نظامت: مشتاق قمر، دیگر شعرا میں ریاض شاہد روحانی، ڈاکٹر عباد نبیل شاد، ممتاز راشد لاہوری، نصیر احمد نصیر، یوسف پنجابی، توقیر بن اسلم، ڈاکٹر ایم ابرار، بی اے شاکر، عابد گیلانی، حافظ جنید رضا، کلیم اللہ، فراست بخاری، جی اے ساقی، شامل تھے۔

❁ 3 دسمبر پلاک میں میوزک محفل ہوئی۔ متعدد گلوکاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ نظامت بی اے شاکر۔

❁ 4 دسمبر کو لاہور پریس کلب میں ثقلین جعفری کے شعری مجموعے ''محبتوں میں کمال کیجیے'' کی تقریب ہوئی۔ صدارت: نذیر قیصر۔ مہمانِ خصوصی: منصور آفاق، صوفیہ بیدار، واجد امیر، شفیق فاروقی، نصیر احمد نصیر۔ نظامت: شاہد اشرف

نامہ ہائے احباب

ارژنگ قدر پیارے حسن عباسی صاحب

السلام علیکم۔ ادب کے خزانوں سے خوش، دل افروز اژرنگ ملا۔ مطالعے کی خوش اطواریوں سے حظ اندوز ہو رہا ہوں۔ آپ نے پہلے اکتفا کی حمد شائع کی تھی اب کے در کنار سے حمد لی ہے۔ اس محبت اور توجہ کا میں دلی قدر داں ہوں۔ لگتا ہے میرے خط آپ تک نہیں پہنچ پاتے۔ قرینے سے ہی محسوس ہوتا ہے۔ بابا جی (اشفاق احمد) کا پرانا انٹرویو بھی نیا نیا لگا۔ بابا جی کی باتیں بہت یاد آتی ہیں منصور آفاق کو مجلس ترقی ادب کی سربراہی مبارک ہو۔ دعا ہے وہ جس طرح شاعری میں لگی لپٹی رکھے بغیر بات کہہ جاتے ہیں۔ اسی طرح مجلس ترقی ادب کو بھی اپنی رونقوں سے شاد و آباد رکھیں گے کہ اس مجلس کو بابرکت اور باکردار لوگوں نے اپنی محنت اور محبت سے متمول کیا تھا۔ ان کے انٹرویو سے معلوم ہوتا ہے کہ عزائم بلند ہیں منصور آفاق صاحب نے قدم رکھتے ہی جو اقدامات کئے ہیں۔ وہ ماشاء اللہ معنی خیز و راحت انگیز ہیں۔ عبدالوحید بسمل سے اپنی پرانی یاد اللہ ہے۔ ارژنگ میں انہیں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ موصوف ہندکو کے بھی اچھے شاعر ہیں۔ ان کے ہندکو مجموعۂ کلام کو ادبی ادبیات پاکستان کا ایوارڈ مل چکا ہے۔ عامر بن علی نے اجمل نیازی مرحوم کو اشک افشاں لفظوں میں یاد کیا ہے۔ اجمل نیازی کی شاعری نئے رنگ اور روپ کی تو تھی ہی ان کی کالم نگاری بھی ''جدت اقتاد'' لہجہ رکھتی تھی۔ نوید مرزا کا اسلم کولسری مرحوم پر مضمون دیکھ کر جی بھر آیا۔ آپ جانیں اسلم کولسری کا شعری اختصاص بہت متاثر کرتا رہا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد نے پاکستانی ادب کے معمار کے سلسلے میں مجھے بھی عزت دی ہے۔ کتاب کی تقریب یہاں ہوئی میں آزاد کشمیر اور ہزارے کے مشاہیر ادب نے برپا کی تھی۔ اس علاقے میں یہ ایک تاریخی تقریب تھی امید ہے ''ارژنگ احباب'' مزے میں ہی ہوں گے۔

خیراندیش

آصف ثاقب

بوئی ہزارہ

ماہ نامہ ارژنگ ہر دوسرے ماہ نظر نواز ہوتا ہے نومبر 21 کا شمارہ چند روز پہلے موصول ہوا۔ دراصل ہر رسالہ اپنے مدیر کے میلانات و رجحانات کا آئینہ ہوتا ہے اور اس میں کچھ ایسا خاص ہوتا ہے جو دوسرے جرائد میں نہیں ہوتا۔ ارژنگ کا امتیاز اس کے ادبی مکالمات ہیں جو اکثر اوقات خاصے کی چیز ہوتے ہیں جن میں ادیب بے تکلف گفتگو کرتے ہیں جن سے عام قاری بھی ادب کے بارے میں آسانی سے جان سکتا ہے۔ موجودہ شمارہ میں اشفاق احمد اور منصور آفاق سے عامر بن علی اور حسن عباسی کے مکالمات شامل ہیں۔ جو بہت دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ میرے نزدیک اس شمارے کی سب سے اہم تحریر جمیل یوسف کی ہے انھوں نے ہمارے عہد کے ایک اہم شاعر نزیر قیصر کی شاعری کا خوب صورت تجزیہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے کچھ ایسے اشعار بھی انتخاب کیے ہیں جو نزیر قیصر کے اسلوب کی ایک نئی جہت کو سامنے لا رہے ہیں کیونکہ ان اشعار میں جمالیاتی سطح پر تازگی کی جگہ فکری تہہ داری کا عمل دخل زیادہ نظر آ رہا ہے مثلاً۔۔

اے غبار ہجوم نقش ٹھہر
چشم کو دیکھنے کی مہلت دے

میں خاک بے نوا تھا مگر میرے ہاتھ سے
کھولا علم فضاؤں میں حرف و بیان کا

بس ایک شام سر دشت کربلا اتری
پھر اس کے بعد گھروں سے علم نکلتا رہا

بکھرتا جاتا ہے کمرے میں سگریٹوں کا دھواں
پڑا ہے خواب کوئی چائے کی پیالی میں

فلک سے لڑتا رہا خاک پر بکھرتا رہا
بہت خراب ہوا میں خدا کے ہونے سے

جمیل یوسف خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کا حسنِ ذوق بھی مثالی ہے میں نے ان کی تنقیدی تحریریں بھی پڑھی ہیں ان میں ایک خاص جمالیاتی احساس برابر دکھائی دیتا ہے۔ اس شمارہ کی دوسری اہم تحریر ڈاکٹر علی محمد خان کی ہے جس میں انھوں نے عامر بن علی کے تازہ سفرنامہ ''نگر نگر اک نظر'' کو موضوع بنایا ہے اس تحریر سے ڈاکٹر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کا پتہ چلتا ہے انھوں نے سفرنامہ کی تاریخ کو کچھ اس طرح سمیٹا ہے کہ گویا کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔ انھوں نے درست فرمایا ہے کہ ''ان کے مذکورہ سفرنامے میں آپ بیتی کے ساتھ ساتھ افسانوی انداز بیان اور ایک مؤرخ کی تحقیقی بصارت بھی کچھ موجود

ہے اور انھوں نے بڑی مہارت اور نادر ونایاب تشبیہات و استعارات سے کام لے کر اپنے قارئین تک اپنی بات بخوبی پہنچائی ہے" ان کے علاوہ ڈاکٹر شاکر کنڈان ، عامر بن علی ،ممتاز راشد لاہوری،اور دیگر مضمون نگاروں نے بھی اپنے اپنے موضوعات کے ساتھ انصاف کیا ہے۔جسٹس میاں نذیر اختر ،ریاض رومانی اور انجینئر ظفر محی الدین کے شعری گوشے بھی اس شمارہ کا حصہ ہیں مجھے ذاتی طور پر ریاض رومانی کی شاعری نے بالخصوص متاثر کیا ہے مثلاً یہ اشعار۔

جواں لہو کو کہاں فرصت ملال میاں لرزتا جسم خیال عدم سے بنتا ہے ستارے چومنے آتے ہیں اس کی مٹی کو جو راستہ ترے نقشِ قدم سے بنتا ہے۔

پروفیسر نور کمال شاہ نے اپنی تحریر میں اچھا مزاح پیدا کیا ہے ان کے ہاں ایک خاص شگفتگی اور بے ساختگی موجود ہے۔افسانے کا حصہ میرے نزدیک کمزور ہے اس پہ خاص توجہ کی ضرورت ہے مجھے یاد ہے کہ جن دنوں عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد نے معاصر جاری کیا تھا تو ان سے ایک دن طاہر اسلم گورا کے دفتر واقع لوئر مال پہ ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے: پرچہ کے لیے سب سے مشکل کام اچھے افسانوں کا حصول ہے جب کہ اس کے بعد اچھے تنقیدی مضامین کا نمبر آتا ہے۔شاعری کے حصہ میں۔نسیم سحر ،ناصر علی سید،ممتاز راشد،آسناتھ کنول،اور شائستہ مفتی کے نام اسے قابلِ توجہ بنا رہے ہیں۔مریم طاہرہ نے رئیس احمد جعفری کا عمدہ تعارف کروایا ہے جبکہ سجاد بخاری نے بابائے اردو مولوی عبدالحق پر اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔حسن عباسی نے بابا سہوتا کے شعری مجموعہ "پچھڑ کے جینا" کا اچھا تعارف پیش کیا ہے۔مجموعی طور پر یہ ایک بھرپور شمارہ ہے اور اس پرچہ کی اشاعت مسلسل پر تمام جملہ مدیران مبارکباد کے مستحق ہیں۔۔ارشد نعیم 3 دسمبر دوپہر ایک بجے

محترم حسن عباسی صاحب

آداب!

امید ہے بخیر ہوں گے۔"ارژنگ" موصول ہوا اور دو دن میں پڑھ ڈالا۔بہت منفرد سلسلے اور تحریریں ماشاء اللہ۔لبنیٰ صفدر کی تحریر دو خاموش آنسو، دل پہ اُترے۔بہت دل گداز تحریر ماشاءاللہ۔

سبھی سلسلے زبردست،اللہ آپ کے کام میں اور برکت ڈالے آمین! سلامت رہیں۔

آسناتھ کنول

لاہور

محترم جناب عباسی صاحب!

سلام مسنون! حسب ارشاد اپنی اور مسعود احمد کی غزلیات ارسال خدمت ہیں۔ ارژنگ کا ادبی حسن دن بدن خوب نکھر رہا ہے۔ بلاشبہ اس کا کریڈٹ آپ اور عامر بن علی کو جاتا ہے۔اللہ کرے روزِ قلم اور زیادہ۔والسلام!

دعا گو: احمد جلیل

محترم ومکرم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔"ارژنگ" ماہ ستمبر ایک دوست نے عنایت کیا۔ شاید اس لئے کہ مذکورہ شمارے میں میرا نعتیہ کلام بہ عنوان گوشۂ نعت شامل ہے۔آپ کی محبت اور کمال مہربانی کہ آپ نے مجھ حقیر،فقیر پُرتقصیر خانہ برانداز (گوشہ نشین) کو عزت دی۔اپنے قلمی اور عملی تعاون سے قرض ادا کرنے کی سعی کروں گا۔آپ سلامت رہیں۔

آئندہ کے لئے ایک غیر مطبوعہ غزل ملفوف ہے امید ہے پسندِ خاطر ہوگی۔زیادہ آداب۔

تصور اقبال

محترم حسن عباسی

السلام علیکم! امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گے،رواں ماہ کا ماہنامہ ارژنگ موصول وہا۔جس پہ آپ کا شکر گزار ہوں گزشتہ ماہ بھی آپ کے نام خط بھیجا تھا مگر کسی میری کوتاہی یا محکمہ ڈاک کی کسی عدم توجہ کے باعث وہ خط آپ تک نہ پہنچ سکا،تاہم ایک نیا خط آپ کے زیر نظر ہے۔ اس خط کی وساطت ماہنامہ اور ارژنگ کے ساتھ ایک خاص بات کی شراکت قائم کر رہا ہوں کہ اپنے سابقہ تمام کلام تخلص میمؔ کے سات لکھتا اور بھیجتا رہا ہوں۔جس پر حلقہ! حباب ذوق میں سے اکثریت کو تشویش تھی کہ میمؔ ایک بے معنی لفظ ہے۔ یہ فقط ایک حرف کی آواز دیتا ہے۔ جس کو کہ آپ نے "م ی م" کو جوڑ کر لفظ بنا رکھا ہے۔ نئے تخلص کا انتخاب میرے لئے دشوار تھا مگر خاصی سوجھ بوجھ کے بعد میمؔ کے بعد دیپؔ کو تخلص منتخب کیا، جو کہ وزن کے اعتبار سے میمؔ کا ہم وزن ہے جو کہ بامعنی ہندی اسم مذکر ہے جس کا مطلب: چراغ،"دیا" دیوا کے ہیں، جس کے انتخاب کے بعد سابقہ اپنی شاعری پر بھی زیادہ زور آزمائی نہیں کرنے پڑے گی اور ان شاء اللہ آئندہ کلام تخلص دیپؔ کے ساتھ موصول ہوں گے نئے تخلص کے ساتھ ایک کلام آپ کے شمارے کی نذر ہے امید کرتا ہوں کلام کی حسب سابق حوصلہ افزائی فرمائیں گے شکریہ! ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ۔والسلام

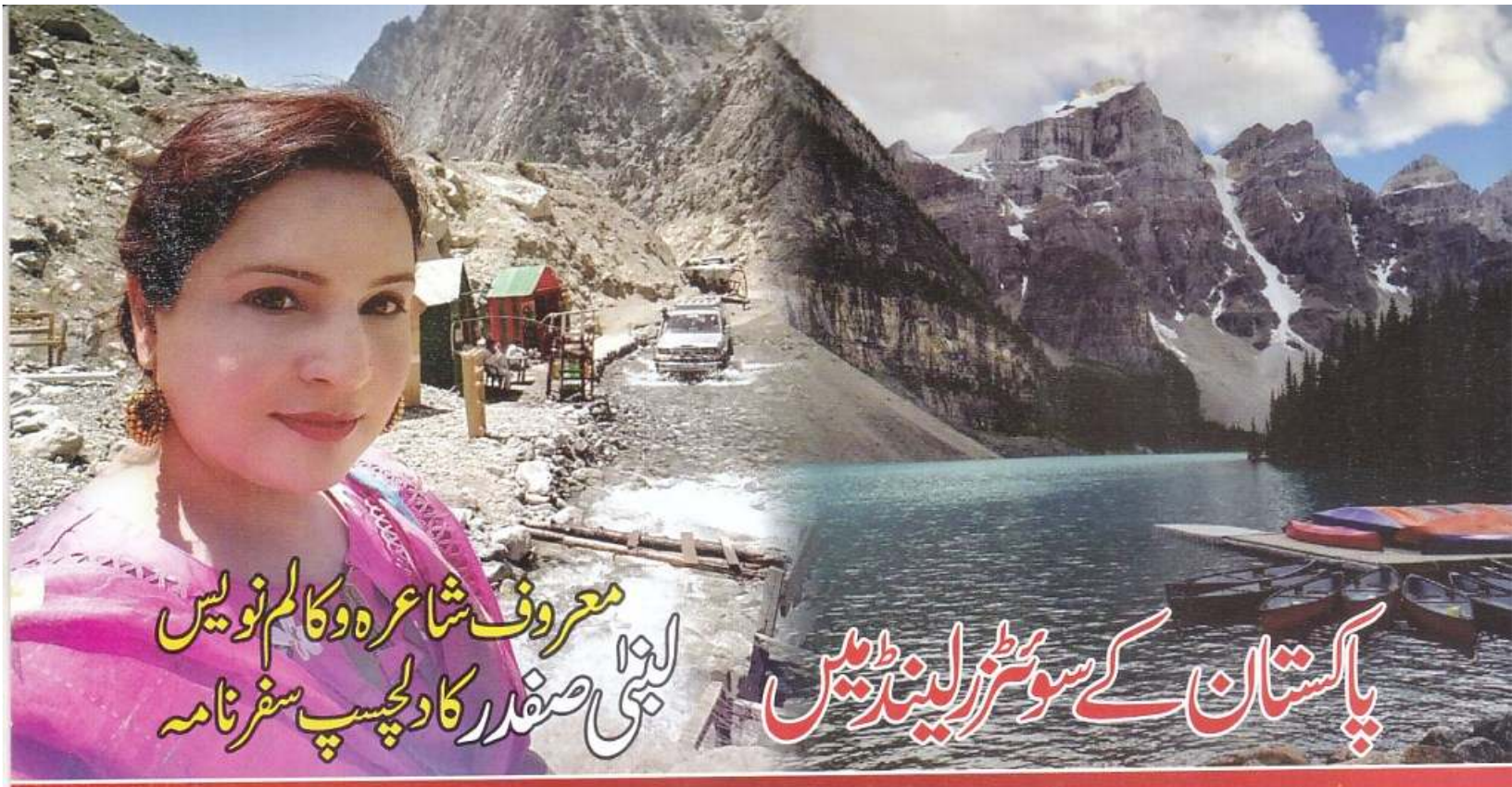

پاکستان کے سوئٹزرلینڈ میں

معروف شاعرہ و کالم نویس لبنیٰ صفدر کا دلچسپ سفرنامہ

سوات کو قریب سے دیکھنے کا تجربہ زندگی کے حسین ترین تجربات میں سے ایک تھا

خدا کو قریب سے دیکھنے کی چاہ ہو تو مظاہر فطرت کو قریب سے دیکھ لیں

قدرت اپنی دلکشی، اپنے حسن سے دلوں کو قابو کر لیتی ہے، روح کو محصور کر لیتی ہے، خدا کو قریب سے دیکھنے کی چاہ ہو تو مظاہر فطرت کو قریب سے دیکھ لیں۔ ہر رنگ اور ہر رُوپ میں اُس کی جلوہ گری ششدر کر دیتی ہے۔ سوات کو قریب سے دیکھنے کا تجربہ زندگی کے حسین ترین تجربات میں سے ایک تھا۔ من پسند ہمسفر ساتھ ہو تو زندگی کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ ماہ جولائی میں پروگرام تشکیل پایا۔ یہ سفر لاہور سے اسلام آباد، اسلام آباد سے مینگورہ اور مینگورہ سے وادی کالام تک رات کے دو بجے آغاز ہوا اور اگلے دن تقریباً اسی وقت میں اختتام پذیر ہوا۔ لاہور سے مینگورہ تک گرمی کی حالت ایک جیسی تھی۔ سفر کے دوران تو اس کا اندازہ ایئر کنڈیشنر کی وجہ سے کچھ زیادہ نہ ہو سکا لیکن مینگورہ کچھ دیر ٹھہرنے پر پتہ چلا کہ لاہور اور مینگورہ کے موسمی حالات کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں لیکن مینگورہ سے جوں جوں آپ کالام کی جانب بڑھنے لگتے ہیں موسم دھیرے دھیرے انگڑائی لے کر ٹھنڈا اور خوشگوار روپ دھارنے لگتا ہے، نرم خوشبو بھری ہوا گالوں کو چھو کر گزرتی ہے تو رُوح تک میں ایک عجیب سی سرشاری بھر جاتی ہے۔ ویسے تو وادی سوات کا سارا سفر آپ کو ہر لمحہ سرشار رکھتا ہے۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

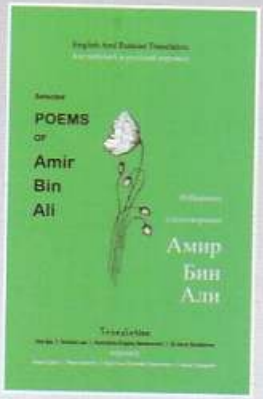

معروف شاعر، منفرد ادیب، مقبول کالم نگار، مترجم اور مدیر

کی تمام کتب کے تازہ ایڈیشن

عامر بن علی

شائع ہوگئے ہیں

پاکستان کے اہم کتب خانوں کے علاوہ ای۔کامرس کی تمام اہم عالمی ویب سائٹس پر دستیاب ہیں۔

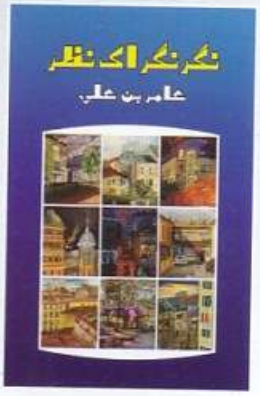

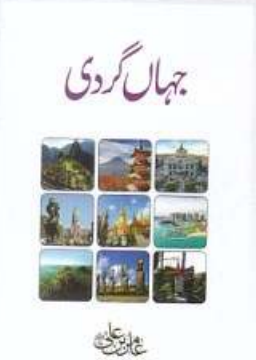

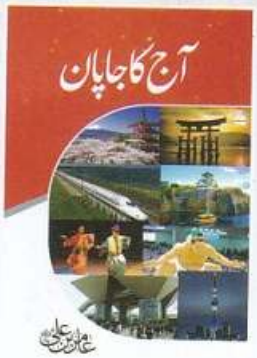

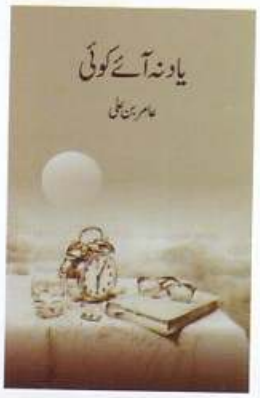

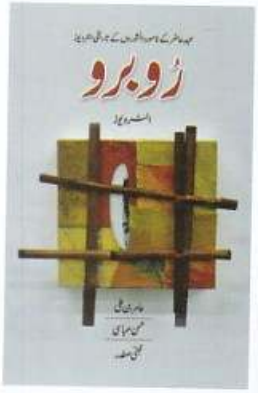

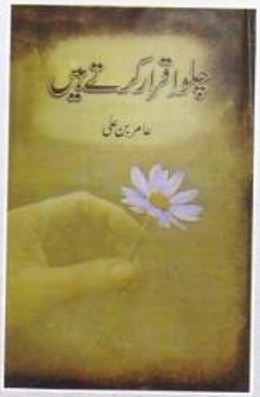

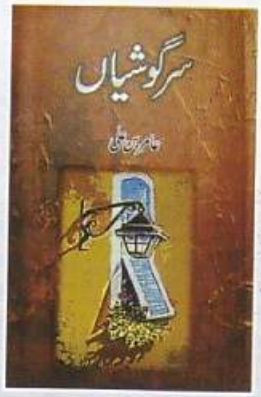

FEEL FREE TO READ ONLINE
www.amirbinali.com

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com